سیر ایران

آزاد

سیرِ ایران

یعنی

غواصِ بحرِ ادب جناب شمس العلماء مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

کا

روزنامچۂ ایران اور ایک دلچسپ لکچر

جو سفرِ ایران پر فرمایا

حسب فرمائش

آغا محمد طاہر نبیرہ حضرتِ آزاد دہلوی

[illegible] محمد بخش پرنٹر کریمی پریس لاہور میں چھپا

قیمت (ہر) مجلد مطلا (عـ)

دیباچہ

اپنے بزرگوں کے وطن کی سیر کا کانٹا جس ذوق وشوق سے مولنا کے پہلو میں کھٹکتا تھا اکثر جگہ تحریروں میں لہو ہو کر ٹپکا ہے مگر وقت کی مجبوری اور واقعات کی مصلحت ہندوستان کا دامن نہ چھوڑنے دیتی تھی۔ اگرچہ علمی و ادبی تحقیقات کے غنچے چٹکیاں لئے جاتے تھے۔ آخر وہ مبارک گھڑی آہی گئی اور مولنا نے بصد اِشتیاق و آرزو ایران کے سفر کے لئے کمر کسی۔ انواع و اقسام کی ہزاروں آرزوؤں اور ولولوں کے سوا کچھ زادِ راہ مولنا کے ساتھ نہ تھا۔ اِس قدر لمبا سفر۔ اور پھر اُس زمانہ کا سفر

کوئی آسان کام نہ تھا۔ مگر اس دُشوار پسند طبیعت نے ہمت اور محبت کے بل پر آسان کر دکھایا۔ گھر اور گھر والوں کو خدا کے سپرد کیا اور خود کراچی سے پار اُتر گئے۔

علمِ تاریخ کے متوالے جانتے ہیں۔ کہ جس طرح آج ہر ایک علم و فن ایجاد و اختراع کا منبع ولایتِ انگلینڈ ہے اِسی طرح ایک زمانہ میں ایران سمجھا جاتا تھا۔ خاصکر ہمارے مشرقی علوم تو اِسی رستے بہہ کر ہم تک پہنچے تھے۔ ایسی حالت میں ہر علم دوست طبیعت کی یہی آرزو ہوتی تھی کہ ایک دفعہ ضرور ان آنکھوں کو ولایتِ ایران کی زیارت سے روشن کرے۔ دوسرے ہزاروں علمی نکتے تھے کہ وقت بے وقت مُلکِ ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں پہنچتے تھے۔ کچھ بگڑے ہوئے آتے تھے کچھ یہاں بگڑ جاتے تھے۔ بال کی کھال اُتارنے والی طبیعتیں انکی تحقیق کرنا چاہتی تھیں اور غرض کہ ہزاروں قسم کی آرزوئیں

اور خواہشیں تھیں کہ ہندوستان کے مستانوں کو **شیراز** اور **اصفہان** میں گلی بہ گلی و کوچہ بکوچہ پھراتی تھیں اور تیوری پر بل نہ آنے دیتی تھیں۔ ایسے اور ان جیسے لاکھوں خیالوں نے مولانا کو **ایران** کا سفر تہ کرایا تھا اور اس تھوڑے سے عرصے میں وہ ادبی کلیاں چُن چُن کر ساتھ لائے کہ مارے خوشی کے پھُولوں نہ سماتے تھے۔ مگر افسوس جیسا کہ وہ چاہتے تھے۔ ان کلیوں اور پھُولوں سے ایک گلدستہ بھی نہ سجا سکے۔ قسمت نے کوئی بھی آرزو پُوری نہ ہونے دی۔

سیاحتِ ایرانؔ کے بعد مولانا نے ہندوستان واپس آکر سخندانِ فارسؔ کو ترتیب دیا۔ قندِ پارسیؔ سے اپنے وطن کے بچّوں کا مُنہ میٹھا کیا۔ اگرچہ ان دونوں کتابوں میں جگہ جگہ اور صفحہ صفحہ پر ایران کی شیریں بیانی نے اپنا رس ٹپکایا ہے مگر مولانا کی سب سے بڑی آرزو ایک فارسی لغت کے تیار کرنیکی

تھی جو شاید اُنھوں نے پُوری بھی کی ہو۔ بہت ممکن ہے کہ بستوں اور مسودوں کے اُلٹ پلٹ کرنے سے تیار بھی ہو جائے۔ اگرچہ فارسی زبان اور فارسی علم ادب ہندوستان میں مُردہ ہو چکا ہے ظاہراً کوئی اُمید بھی باقی نہیں کہ پھر زندہ ہو۔ مگر پھر بھی اگر وہ لغت[۱] مل گئی اور خوش قسمتی سے چھپ گئی تو مولنا کی معنوی یادگاروں میں سے ایک عجیب و غریب یادگار رہو گی۔

دوسری آرزو سفرنامہ ایران تھا جس کو وہ ترتیب ہی نہ دے سکے۔ حالات اور واقعات پرچوں اور پُرزوں پر ہونگے زمانہ نے اِتنی فرصت ہی نہ دی کہ آرام سے بیٹھیں۔ اطمینان کے دامن پہ ان لپیٹے ہوئے گٹھوں کو کھولیں۔ چھوٹے چھوٹے نوٹوں سے بڑے بڑے واقعات کی یاد کو تازہ کریں۔ اور اس رشکِ ارم ملک کی تصویر مولنا اپنے ہاتھ سے کھینچیں۔ سفر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد تخیل کے دریا میں تلاطم آیا

[۱] خدا کا شکر ہے کہ لغت مکمل مل گئی ہے۔ طاہر

واقعات تبدیل ہونے شروع ہوئے۔ ادھر سے طبیعت ہی اچاٹ ہوگئی۔ مہینوں اور برسوں کی عرق ریزیاں کاغذ کے دفتروں میں سمٹ کر بستوں میں سوگئیں اور مولٰنا کے کان میں کسی نے چُپکے سے کہدیا کہ ؎

ہوش و خرد کو دیکھ لیا دردِ سر میں ذوق

آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

پھر کیا تھا۔ عالم ہی اور ہو گیا۔ دُنیا کا رنگ ہی بدل گیا۔ وہ بات ہی بگڑ گئی۔ سفر اور سفرنامہ دونوں کو بھُول گئے۔ پھر کس کی مجال تھی کہ ان کھُلے دفتروں کو سمیٹتا۔ ان اُلجھی زلفوں کو سُلجھاتا خُدا جانے وہ کیا حسرت خیز دیوانہ پن تھا۔ جس نے پھر اِدھر کا رُخ ہی نہ کیا۔

آخر زمانہ نے ان ورقوں کو بھی اُلٹ دیا۔ دِن مہینے اور سال گُذر گئے۔ مولٰنا دُنیا سے اُٹھ گئے۔ وہ شمع جو بیس بائیس

سال سے ہوائے وحشت کا دم بھرتی تھی بُجھ گئی۔ اس شمع کے پروانے بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے۔ اب بھی چند وجود باقی ہیں۔ جو پرانے واقعات کے نقشے کھینچتے ہیں۔ ان بگڑی ہوئی بزموں کی یاد سے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔ نئی پود کو سُناتے ہیں کہ ہم نے مولنا کو یہاں دیکھا تھا۔ وہاں نہر کے کنارے بیٹھے شعر پڑھ رہے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ میں نے اسی باغ میں مولنا کے قدم لئے تھے۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر دُعائیں دی تھیں۔ کسی کو یہ صدمہ ہے کہ مولنا نے مجھے پہچانا تو تھا مگر بات نہ کی۔ کسی کو قلق ہے کہ مجھے پہچانا ہی نہ تھا مگر یہ باتیں بھی چند روزہ ہیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ ہستیاں بھی نہ رہیں گی۔ یہ تصویریں بھی مِٹ جائیں گی۔ پھر کون جانے گا کہ سوائے چند مطبوعہ کتابوں کے آزاد نے اپنے ملک کی زبان کے لئے کیا کیا جانفشانیاں کی تھیں۔ آزاد کون تھے۔ کہاں رہتے تھے۔

کس کس جگہ گئے تھے۔ اور زبانِ اُردو پر کس کس طرح جان چھڑکتے رہے تھے۔

ترقی یافتہ قوموں کے بڑے بڑے ادیبوں اور فلاسفروں کے سفرنامے اور سوانح عمریاں ہی ایسی بیش بہا چیزیں سمجھی جاتی ہیں کہ جن کی روشنی گذشتہ اور آئندہ منزلوں پر چومک کا کام دیتی ہے اور جو آنے والی نسلوں کے سدھارنے کے لئے بہت کچھ مدد دیتی ہیں۔ مگر کس قلم سے لکھوں دل خون ہوا جاتا ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا انشا پرداز اقلیمِ سخن کا تاجدار قلزمِ تاریخ کا شناور نئی نثر و نظم کا موجد ان دونوں چیزوں سے محروم گیا۔

ہمارے بعد کے اُردو بولنے والے کیا جانیں گے کہ آزاد نے کس طرح سفر کیا تھا۔ اور اس میں ہمارے لئے کیا کچھ کیا تھا میں نے ہر چند تلاش کیا۔ مگر ان کے سفر کا کوئی خاص روزنامچہ

یا سفرنامہ ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نہ ملا۔ فقط ایک پھٹا پُرانا رفیقِ ہند اخبار کا پرچہ ہاتھ آیا ہے جس میں ایک لکچر سفرِ ایران کے متعلق ہے اس کے علاوہ چند چھوٹے چھوٹے کاغذوں کا ایک گٹھا سا مِلا جس میں نوٹ لکھے ہیں جن کا پڑھنا دشوار اور ترتیب دینا ناممکن تھا پھر بھی جس قدر ممکن ہو سکا موزوں کر کے روزنامچہ کے نام سے چھپوا دیا ہے

اس طول و طویل سفر سے مولنٰا جولائی ۱۸۸۶ء میں واپس تشریف لائے تھے۔ اس وقت کی تعلیم یافتہ جماعت میں جو خوشی مولنٰا کے واپس بخیر و عافیت تشریف لانے سے ہوئی ہو گی۔ اس کا اندازہ وہی خوب لگا سکتے ہیں۔ جن کے سینوں میں دل ہو اور دل میں کسی کے لئے محبت ہو۔ اور پھر وہ کسی کے منتظر ہوں خیر۔ غرض کہ لاہور والوں نے بصد اشتیاق ۲۴ جولائی ۱۸۸۶ء کو انجمن ہال میں جلسہ منعقد کیا۔ جس کا اعلان کچھ دن پیشتر ہی کر دیا گیا تھا۔ اس جلسہ اور لکچر کا چرچا کئی دن سے لاہور میں ہو رہا تھا

اکثر احباب امرتسر و اطراف لاہور سے لکچر سننے کے لئے تشریف لائے تھے تعلیم یافتہ اصحاب اور تمام طالب علم نورمل سکول وغیرہ کے جو امتحانوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ اسی کے انتظار میں ٹھیرے رہے جلسہ کے موقع پر حاضرین و شائقین کی تعداد حدِ ہجوم سے بھی بڑھ گئی تھی۔ باوجود اس کے جس وقت مولنا نے لکچر دینا شروع کیا۔ عجیب چپ چاپ اور سناٹے کا عالم تھا۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔ مختلف اخبارات کے ایڈیٹر اور نامہ نگاران برستے پھولوں کو کاغذ کے دامن پر سمیٹ رہے تھے۔

وہ بڑے خوش قسمت وجود تھے۔ جنہوں نے تاجدارِ اُردو کو خود چہکتے اور مہکتے دیکھا ہوگا۔ اور ولایتِ ایران کی تصویریں اس مصورِ فطرت کی زبان سے کھچتی ہوئی دیکھی ہونگی۔ اور لاہور میں بیٹھ کر ایران کی سیر کے لطف اُٹھائے ہونگے۔

یہ لکچر اگرچہ نہایت ہی مختصر دریا میں سے قطرہ کی مثال ہے

مگر اس رشکِ ملٹن و شکسپیئر کی زبان سے نکلے ہوئے جواہر ریزے دل میں اُتر جانے والے چھوٹے چھوٹے جملے ایسے نہیں کہ ان کو بھلا دیا جائے۔ دل نہیں چاہتا کہ ہم اور ہم سے آئندہ آنے والی نسلیں اس مہک سے محروم رہیں۔ اگرچہ یہ پورا سفرنامہ تو نہیں ہے لیکن کیا ہوا۔ اسی چمن کا ایک پھول ہے۔ انہیں پھولوں کی ایک تھوڑی سی خوشبو ہے۔ غور سے دیکھو تو اس میں بھی وہی گوہر غلطاں کی چمک ہے۔ اب اسی کو غنیمت جان کر چھپوائے دیتا ہوں تاکہ کچھ تو مولانا کے سفر کی یاد باقی رہ جائے۔ خواہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔

دُعا کا محتاج

طاہرہ نبیرہ آزاد

لکچر

شرفائے قوم!

بندہ آزاد خیر مقدم کہتا ہے آپ صاحبوں کو جو اس جلسہ میں تشریف لائے اور سلامت باشید کہتا ہے اُن اخبارو کو جنہوں نے مراجعتِ سفر پر مبارکباد دی۔ آپ نے میری مختصر سیاحت کو حب الوطن کا جوش سمجھ کر اتنا بڑھایا اور پھر بڑھایا اور میں کوتاہیٔ خدمت پر شرمسار دیکھ رہا ہوں۔

بات فقط اتنی ہے کہ بڑھاپے نے عصائے پیری کے اشارہ سے جوان ہمتوں کو میدان دکھایا ہے یعنی میں دوڑ نہیں

سکتا۔ تم دوڑو کہ کامیابی کی منزلیں قدم قدم پر موجود ہیں۔
سرمایہ خدمت فقط اتنا ہے کہ لاہور سے آتش فشاں اژدہے
پر سوار ہو کر فرشِ خاک کو لپیٹا۔ دو دن اور رات میں کراچی جا اُترا۔
وہاں سے نہنگِ دُخانی پر بیٹھ کر سطح آب کو طے کیا اور دسویں
دن بوشہر میں جا پہنچا۔ جہاز میں دورانِ سر اور برہمی طبع کی طرف
سے بڑا اندیشہ تھا کہ صفراوی مزاج ہوں۔ مگر شکرِ خدا کہ معلوم
بھی نہ ہوا۔ بڑا سبب اس کا یہ ہے کہ شوقِ سفر اور سواری جہاز
کے ذوق سے دل ایسا لبریز تھا کہ جب جہاز چند میل
نکل گیا۔ تب یاد آیا کہ خللہائے مذکورہ کا اثر مجھ پر ہے یا نہیں؟
اُس وقت خیال کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔
بوشہر برائے نام ملکِ غیر ہے۔ کارداران ایرانی ہمارے
ساتھ اپنوں سے بہت زیادہ رعایت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔
مجھے یہاں سب سے پہلے نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے

بچے کھیلتے تھے۔ فارسی بولتے تھے جیسے ہزار داستان اور اس خوش ادائی سے بات کو ادا کرتے تھے کہ میں منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ بوشہر ایک گرم مقام ہے۔ کھجوروں کی بہتات تھی۔ اناروں کا موسم تھا مگر اس کثرت کے ساتھ نہ تھے۔ اور ویسے لطافت اور آبداری بھی کم تھی۔ آٹھ دن کے انتظار کے بعد ایک ایرانی راہوار پر بیٹھ کر کاروان میں روانہ ہوا۔ ۹ دن تک کچھ پہاڑ کچھ میدان لپیٹ سپیٹ شیراز میں جا اترا۔

شیراز کے دیکھنے کا ارمان تھا۔ ایک عمر کے بعد خدا نے پورا کیا۔ اللہ اللہ۔ خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا پیارا وطن جس پر وہ لوگ تعریفوں اور دعاؤں کے پھول چڑھائیں۔ اس کے دیکھنے کا ارمان کیوں نہ ہو۔ میں نے دیکھا اور تعجب کے ساتھ دیکھا۔ کیونکہ جس شیراز پر نورانی بزرگوں نے نور برسائے تھے اس کی رونق و آبادی ان کے ساتھ ہی رحلت کر گئی۔ اب بڑی بڑی وسیع اور

بلند پُرانی مسجدیں اور کہنہ مدرسے گرے پڑے۔ کھڑے ہیں اور بنانے والوں کی ہمتوں پر دلائل پیش کر رہے ہیں۔ اُن میں نوجوان لڑکے صرف نحو۔ بلاغت۔ فقہ۔ اصول کی کتابیں سامنے رکھے۔ بے مدد کتاب کے مسائل کتابی پر بحث کرتے ہیں علما کتب علمیہ کی تدریس سے پُرانی ہڈیوں پر آب حیات چھڑکتے ہیں۔ یہ بات جتانے کے قابل ہے کہ وہاں ہندوستان کی طرح طلبا رفقرہ بہ فقرہ سبق نہیں پڑھتے۔ اُستاد کتاب سامنے رکھے بیٹھا ہے۔ طلبا اپنی کتاب کھولے خاموش بیٹھے ہیں۔ اُستاد کتاب کو دیکھتا ہے اور اُس کے مطالب کو نہایت توضیح اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا جاتا ہے۔ طلبا سُنتے جاتے ہیں۔ جتنی جس کے دامن میں وسعت ہو پھل پھول بھر لے۔

غرض شہر شیراز کا اب یہ حال ہے کہ وہ عالیشان اور سیدھا بازار اور بلند اور فراخ مسجد جو کریم خان زند نے سو برس

پہلے بنائی ہے اگر وہاں سے اُٹھا لیں تو اصل شیراز ایک معمولی قصبہ رہ جاتا ہے۔ چند سال ہوئے مشیر الملک نے بھی رفیع الشان مسجد اور کارواں سرائے سے پُرانے شہر کو نیا کیا ہے۔

نواب مرزا علی خان صدر ایک امیر خاندانی کی زندگانی شیراز کے لئے سرمایۂ آبادانی ہے اور اُن کی مہمان نوازی اُس پاک مٹی کے لئے قدیمی قبالہ ہے۔ مجھے بھی دو دن مہمان رکھا باوجود دستگاہ امارت اور پیرانہ سالی کے جب دیکھو۔ گرد کتابیں چنی ہیں۔ ایک دو مُلّا پاس بیٹھے ہیں۔ بیچ میں آپ مطالعہ میں مصروف ہیں۔ تصحیح کرتے ہیں۔ حواشی لکھتے ہیں۔ ایک خوشنویس کاتب ناقص کتابوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ مُصوّر نقاشی کر رہا ہے۔ کھانے کا وقت ہوا۔ وہیں پہلو میں دسترخوان بچھا۔ اُٹھے پہلے سجدۂ شکرانہ بجا لائے۔ ایک روٹی کو اُٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ پھر سب کے ساتھ کھانا کھایا۔ یہ بھی گویا ایک فرض تھا کہ ادا کر لیا۔ پھر کتابوں کے

سے حلقے میں جا بیٹھے۔

اِن کے والد مرحوم کی تصنیفات سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں ہیں بعض ان میں سے میں نے بازار سے خریدیں۔اِن میں سے اِس رسالہ کا پیش کرنا واجب ہے جو کہ اُنھوں نے حرکتِ زمین کے اثبات میں لکھا تھا۔ نوابؔ ممدوح نے خود اس کی نقل مجھے عنایت فرمائی ہے۔آج سے ۴۰ برس پہلے ایشیائی تعلیم میں ایسے خیالات کا پیدا کرنا خاکِ پارس کی پاکیزگی کی دلیل ہے۔

اِسی سلسلہ میں حکیم حاذق حاجی مرزاؔ احسنؔ کا ذکر بھی واجب ہے۔اُنھوں نے ایک مُفصّل تاریخ شیراز کی لکھ کر پارس نامہ نام رکھا ہے اور ان کا علو خاندان مجھے کتابوں سے حد ثبوت کو پہنچا معلوم ہوا۔ساتویں پُشت میں خواجہ شاہ منصورؔ اور چوتھی پشت میں سید علی خانؔ بلاغت کی اولاد ہیں۔سید علی خان کی تصنیفات شہرہ آفاق ہیں۔ان کی تفصیل اپنے سفرنامہ کے لئے امانت رکھتا ہوں۔

حکیم صاحب خبر سُنکر نواب صدر کے ہاں آئے۔ باوجودیکہ میری روانگی میں ایک شب باقی تھی۔ شام ہو گئی تھی۔ بُوندیں پڑ رہی تھیں۔ باصرار اجازت لیکر اپنے گھر لے گئے۔ رات بھر اپنی کتاب سُناتے رہے۔ مطالب پر مشورہ کرتے رہے۔ میری کتاب یادداشت نے بھی اُس کے اکثر مطالب سے سرمایہ حاصل کیا۔

یہ اہلِ ایران میں عام دستور ہے کہ ہر اشراف سفید پوش کے مکان کے ساتھ ایک مردانہ مکان ہوتا ہے وہ حرم سرا سے زیادہ آراستہ ہوتا ہے اور ضروریات کے سامان موجود ہوتے ہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ موافق طبع دوست صبح مُلاقات کو آیا۔ ظہر کی نماز پڑھ کر رُخصت ہوا۔ یا رات کو رہا صبح ناشتا کر کے رُخصت ہوا۔

شیراز کے لوگ اب تک لباس و اوضاع میں اپنے بزرگوں کی تصویر ہیں۔ علما اور ثقہ لوگ عمامہ باندھتے ہیں عبا پہنتے ہیں۔ خاندانی ترک کلاہ پوست برہ کی پہنتے ہیں۔ طہران کے

اوضاع جدید ابھی تک وہاں لذیذ نہیں ہوئے۔

شیراز میں چھوٹی چھوٹی ٹکیاں بکتی دیکھیں کہ اِن سے لوگ سر اور ڈاڑھیاں دھوتے تھے۔ وہ ایک قسم کی مٹی ہے جس کی کان شہر کے پاس ہے۔ اس میں خوشبو کے اُٹھانے کی قدرتی تاثیر ہے۔ اُسے پھولوں میں بسا کر صاف کرتے ہیں اور ٹکیاں بنا کر بیچتے ہیں۔ شہروں میں تحفہ لے جاتے ہیں۔ گِل گُل اس کا نام ہے مجھے گلستان کا سبق یاد آیا۔ ع

گِلِ خوشبوئے در حمام روزے

جن دنوں ہم نے پڑھا تھا تو خدا جانے کیا سمجھے تھے۔ پھر ایک خیالِ شاعرانہ سمجھتے رہے۔ اب معلوم ہوا کہ شیراز کا اصلی تحفہ ہے جاڑے کا موسم کوہ کوہ برف لئے سر پہ چلا آتا تھا۔ بڑھاپے نے خوف کے لحاف میں دبک کر کہا کہ شیراز تو دیکھ لیا۔ اب اصفہان کو دیکھو اور آگے بڑھو کہ تلاش کی منزل ابھی دور ہے

شیراز کے دوست بہت روکتے اور رستہ کے جاڑے سے
ڈراتے رہے مگر جب کاروان چلا۔ مجھے اشتیاق نے اُٹھا کر
کجاوہ میں بٹھا دیا۔ ۴-۴-۵-۵ کوس پر شاہ عباسی سرائیں آباد
موجود تھیں۔ جن کی پختگی اور وسعت قلعوں کو ٹکر مارتی تھی۔ اِن
سراؤں میں مسافر اگر روپیہ رکھتا ہو تو خاطر خواہ سامان آسائش
کا ملتا ہے۔ چار پانچ آنہ کو مُرغ اور پیسے کے دو دو انڈے
ہر قسم کے تر و خشک میوے نہایت اعلےٰ اور نہایت ارزاں
ملتے ہیں۔

رستہ آبِ رواں سے سبز اور آبادیوں سے معمور تھا
جہاں منزل کرتا۔ گاؤں میں جا کر پوچھتا اور جو اہلِ علم ہوتا اُس
سے مُلاقات کرتا۔ چھوٹی سے چھوٹی آبادی میں بھی ایک دو عالم
اور بعضے صاحب اجتہاد ہوتے تھے۔ اُن کی حالت دیکھ کر
تعجب آتا تھا۔ مثلاً کھیت سے گائے کے لئے گھاس کندھے پر

لئے آتے ہیں۔ یا نہر پر کپڑے دھو رہے ہیں۔ لڑکا گھر کی دیوار
چُن رہا ہے۔ جب فارغ ہوئے تو اُسے شرح لمعہ یا قوانین الاصول
کا سبق پڑھانے لگے۔ جب اُن سے پوچھتا کہ کسی شہر میں جا کر
ترویج علم کیوں نہیں کرتے؟ کہ رواج کا رہی ہو۔ تو کہتے کہ وہاں
خلوت کا لطف نہیں رہتا حضور قلب میں خلل آتا ہے۔ دنیا
چند روز ہے۔ گذار دیں گے اور گذر جائیں گے۔ یہ علمی روشنی
کُل مملکتِ ایران میں عام ہے کہ شاہانِ سلف کی پھیلائی ہوئی ہے
مَیں اُن سے کہتا تھا کہ ہماری تمہاری تو جس طرح گذری
گذر گئی۔ لڑکوں کو طہران بھیجو اور دار الفنون پڑھواؤ کہ زمانہ کی
ہوا پھر گئی ہے۔ اکثر ہنس دیتے اور میرے ساتھ ہم داستان
ہو کر کہتے۔ اِنہی کو کہو کہ ان کا معاملہ ہے۔ بعضے بحثنے لگتے اور
آخر اتفاق رائے کرتے تھے۔

میرے پاس کھانے پکانے کا سامان نہ تھا۔ وہیں بیٹھ کر کسی

گھر سے روٹی مول لیتا۔ کہیں سے انڈے کہیں سے گھی۔ اشکنہ یعنے انڈوں کا قلیہ پکاتا۔ اس میں روٹی ڈبوتا۔ کھاتا اور شکر الٰہی بجا لاتا۔ اس میں بہت باتوں اور تحقیقاتوں کے موقع ملتے تھے۔ اور وہ لوگ اِن کاموں میں میری مدد کرنی مہمان نوازی کا جُزو سمجھتے تھے جو کہ حقیقت میں فرضِ مذہبی ہے۔ غرض بارہ دن کے بعد اصفہان میں جا اُترا۔ شہر سے پہلے تختِ فولاد کا میدان سامنے آیا۔ یہاں ہزاروں بزرگانِ دین اور سترگانِ دُنیا کے اجسام بے ارواح نے شہرِ خاموشاں بسایا ہے۔ میر باقرِ داماد علیہ الرحمۃ صاحبِ حکمتِ یمانیہ نے خاک پہ سو کر نام کو زندہ کیا ہے۔ جمعرات کا دن تھا۔ صدہا زن و مرد قبروں پر فاتحہ پڑھنے آئے تھے۔ رفتہ رفتہ دروازہ شہر نمودار ہوا۔ اور ایک وسیع سڑک سامنے آئی۔ جسے سفید دیواروں کی بلند قطاروں اور سر بفلک چناروں اور دو نہروں نے ۵ متوازی خیابانوں میں تقسیم کیا ہے۔ بے اختیار

زبان سے نکلا کہ زہے سلاطینِ صفویہ بادشاہی ہو تو ایسی ہو۔

خیابانِ مذکور میں کئی میل چل کر وہ دریائے وسیع آیا۔ جسے زندہ رود کہتے ہیں۔ اصفہان کا تمام علاقہ اس سے زندہ ہے یہاں کتابوں میں اِس کا نام پڑھ کر مزے لیا کرتا تھا۔ اب دیکھا باوجودیکہ انگریزی پُلوں کو دیکھ کر اب کوئی پُل نظر میں نہیں جچتا پھر بھی اس کا پُل دیکھنے کے قابل ہے۔

شہر اصفہان کی وسعت فی الحقیقت بہت فراخ ہے اِس نے فارسی مبالغہ کو درست موقع دیا کہ شعرا نے کہا ؎

جہاں را اگر اصفہانے نبود
جہاں آفریں را جہانے نبود

دوسرے نے کہا ؎

اصفہاں نیمۂ جہاں گفتند
نیمۂ وصف اصفہاں گفتند

یہ شہر سلاطینِ صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے۔ عمارات عالیشان کا حال کیا کہوں۔ صبح سے شام تک پھرتا تھا۔ رات کو آکر بستر پہ گر پڑتا تھا۔ مُلا باقرِ مجلسی علیہ الرحمۃ کی قبر پر گیا۔ مسجد جامع کی گوشہ میں ایک الگ مکان ہے۔ اِس میں باپ بیٹے برابر پڑے سوتے ہیں۔ دو مُلا قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ اِن کی قبروں کے کتابے بڑی مشکل سے لِکھے۔ یہ جگہ مہینوں رہنے کی تھی۔ مگر جاڑے کے ڈر نے پانچ دن سے زیادہ نہ ٹھیرنے دیا۔ مجھے بھی یہ خیال تھا کہ چلے چلو۔ طہران میں چل کر ڈیرے ڈالیں گے۔

اصفہان سے آٹھ منزل چل کر کاشان میں پہنچا۔ مخمل بافوں کی صنعت اب تک اس کے نام کو چمکاتی ہے۔ فاضل رحمانی مُلا محسن کاشانی علیہ الرحمۃ کا مزار اب تک مرجعِ خاص و عام ہے۔ تین دن یہاں رہا۔ چوتھے دن شہر قم میں پہنچا۔ یہاں سلطان دنیا و دین امام ہشتمیں علی ابنِ موسےٰ رضا کی ہمشیرہ کا مزارِ مقدس ہے۔ اور

دن رات دربار شاہانہ لگا ہوا ہے۔ کئی عالم نامی وگرامی موجود ہیں
شیخ ابن بابویہ قمی علیہ الرحمۃ یہاں مدفون ہیں۔ دن بھر میں کئی دفعہ
ان کی قبر پر جا کر بیٹھتا اور برکت حاصل کرتا تھا۔ قبر کے سرہانے
کی سطح پر وہ توقیع (فرمان) چینی کے حرفوں میں منقوش ہے۔ جو حضرت
صاحب الزمان کی طرف سے انہیں آیا تھا۔ میں نے اس کی نقل
بڑی احتیاط سے لکھی ہے۔ یہاں تین بزرگ اور مدفون ہیں جو
سفر طوس امام علیہ السلام کے ہمرکاب تھے اور اکثر ہم پلہ کجاوہ ہیں
ہوتے تھے۔ ان کی قبروں کے کتبے بھی نقل کر کے لایا ہوں۔
محمد شاہ۔ شاہ حال کے والد اور فتح علی شاہ دادا یہاں مدفون ہیں
ان کی قبروں پہ ان کی تصویریں عمدہ دستکاری کیساتھ منقوش ہیں
اصفہان سے پندرہ منزلیں طے کر کے طہران میں داخل ہوا
لوگ اسے دار الخلافہ ایران کہتے ہیں لیکن حقیقت میں شاہ کی
برکت ہمت سے آج علوم وفنون۔ تہذیب اور دولت و اقبال

کا دارالخلافہ ہے تفصیل اس کی سفرنامہ کے حوالہ کرکے مختصر کہتا ہوں کہ پہلے اصفہان اور قزوین شاہ نشین دارالخلافے تھے۔ فتح علی شاہ نے مصالح ملکی پر نظر کرکے کوہ دماوند کے دامن میں شہر آباد کیا اور اسے دارالخلافہ قرار دیا۔ اس کی آبادی کی عمر ۱۰۰ برس سے زیادہ نہیں۔ شہر رَے قدیمی شہر اس کے پہلو میں ۳۔۴ میل کے فاصلہ پر ویران پڑا ہے۔ طہران کے بازار پٹے ہوئے اور مسجدیں اور عالیشان مدرسے بھی قدیمی شہروں کی طرز پر تعمیر ہیں۔ شاہ جمجاہ نے جو سفر یورپ سے آکر ملک و مملکت میں روشنی پھیلائی ہے تو شہر کے باہر قصر عالیشان بنا کر شمس العمارۃ نام رکھا ہے۔ اس کے پہلو میں مدرسہ دارالفنون بنایا ہے جسے یونیورسٹی کہنا چاہیے۔ عمارت کی وضع بھی انگریزی طرز پر ہے۔ اس میں فرنچ انگریز اور روس کے مدرّس زبانیں اور علوم و فنون سکھاتے ہیں۔ اور ایران کے نئے تعلیم یافتہ بھی مدرّس ہو گئے ہیں۔

مکان مذکور کے پہلو میں دار التصنیف۔ دار الترجمہ۔ دار الطباعہ (مطبع)۔ دار العدالت وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اس کے برابر میدان نظام (قواعد فوج) ہے وہاں سے چار طرف وسیع سڑکیں کوسوں چلی جاتی ہیں۔ دو طرف کی سڑکوں پر کھلے (بے سقف) بازار ہیں دونو طرف یکساں دُکانیں اور چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں سوداگروں اور ہنرمندوں کی ہیں۔ ان میں ایران اور یورپ کے لوگ آباد ہیں اور سڑک پر ایرانی اُمرا گھوڑے اور رنگ رنگ کی بگیاں دوڑاتے پھرتے ہیں۔

مجھے اِس سفر میں بڑی غرض کتابوں کی تلاش تھی۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ جامع لغاتِ فارسی کے لئے سرمایہ جمع کروں اِس لئے جاتے ہی مطلب کے ٹھکانے ڈھونڈھنے شروع کئے خوش نصیبی نے پہلے شہزادۂ آزادہ معتمد الدولہ نواب فرہاد مرزا کی حضور میں پہنچایا۔ یہ صاحبِ علم۔ صاحبِ فضل صاحبِ ہمّت

حکومت کے تجربہ کار۔ شاہزادۂ روزگار۔ نائب السلطنت عباس مرزا
کے خلف الرشید فتح علی شاہ جنت مکان کے پوتے۔ چچا
شاہ حمجاہ کے ہیں۔ وہ اوصاف مذکورہ کے ساتھ دیندار اور
نہایت پرہیزگار ہیں۔ باوجود اس کے خوش مزاج۔ خندہ جبیں
نورانی صورت۔ حاکمانہ درباروں اور عالمانہ جلسوں کو خوش طبعی
کے ساتھ گلزار رکھتے ہیں۔ میں ان کے علمی درباروں میں ہمیشہ
حسب الارشاد حاضر ہوتا تھا۔ رخصت کے وقت ایک تصویر
بھی عنایت فرمائی اور دو دو نسخے کتابوں کے دیئے۔ جو خود
تصنیف کی تھیں۔ یا فرمایش و تصحیح سے چھپوائی تھیں۔ فرمایا کہ
کتب خانہ آزاد میں یادگار رکھنا۔ اگرچہ بڑھاپے اور دماغی
محنتوں نے انہیں نہایت ضعیف کر دیا ہے اس پر بھی ہمیشہ
تصنیف جاری ہے۔ کئی عالم نوکر ہیں۔ وہ بھی علمی کاموں میں
مصروف ہیں۔ شاہ کے دربار میں جو مقدمہ کہ علم سے متعلق ہوتا

ہے یا سلطنت کا پیچیدہ معاملہ ہوتا ہے۔ اِن کی اِصلاح سے طے ہوتا ہے۔ ان کا کتب خانہ تمام ایران میں لاثانی مشہور ہے اِن کے بڑے صاحبزادے آنکھوں کے علاج کے لئے ولایت پروشیہ میں گئے ہوئے تھے۔ چھوٹے یعنی احتشام الملک عبد العلی میرزا موجود تھے۔ تقریباً ۲۵-۲۶ برس کی عمر میں فاضل کامل ہیں۔ مگر علم الٰہیات کا بہت شوق ہے۔ دو دفعہ شرح اِشارات پڑھا چکے ہیں۔ فرنچ زبان خوب بولتے ہیں۔ اور انہی کے ذریعہ سے یوروپ کے علوم جدیدہ حاصل کئے ہیں تعلیم سخن کا کمال شوق ہے۔ طرزِ قدیم میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ میرے حال پر دلی شفقت سے مرحمت فرماتے تھے اور حصولِ مقاصد میں مدد کرتے تھے۔ اِن سے بھی تحقیقِ الفاظ میں بہت فوائد حاصل کئے۔

شاہزادۂ نورانی کی وساطت سے اکثر علما کی ملاقات اور

اُمرا سے ملازمت حاصل کی خصوصاً امیر خاندانی نواب مخبر الدولہ[1] وزیر تعلیم۔ ان کے والد مرحوم رضا قلی خان للہ باشی اکثر شاہزادوں کے اتالیق تھے۔ انجمن آرائے فارسی ایک جامع کتاب لغات فارسی میں۔ تذکرہ فصحائے فارس کا فن سخن میں۔ روضۃ الصفائے ناصری تاریخ میں لکھی ہے۔ یہ ایک ایک ضخیم کتاب کارنامہ اپنے اپنے فن کا ہے۔ اور چھوٹی کتابوں کی تفصیل دیباچہ تذکرۃ الفصحا سے معلوم ہو سکتی ہے۔ مخبر الدولہ بہادر کے چار فرزند ہیں۔ ایسے سعادت مند کہ خدا بیٹے دے تو ایسے دے۔ چاروں نے علوم مغربی سے دماغ روشن کئے ہیں کوئی پیرس سے ڈگری حاصل کر کے آیا ہے۔ کوئی برلن سے وغیرہ وغیرہ۔ بڑا بیٹا

---

[1] نواب موصوف کے ایک بھائی مرزا محمد تقی خان ہیں صاحب علم صاحب آگاہی۔ انکی تالیف کا شوق دستور العمل بننے کے لائق ہے اور مروّت اور محبت ان کی پرستش کیلئے زیبا ہے۔ ۷ بجے سے لیکر ۵ بجے تک جب جا کر دیکھو اسی طرح کام میں مصروف ہیں۔ کہ بات کرنے کی فرصت نہیں۔ مجھ سے دلی محبت رکھتے تھے۔

سررشتۂ ٹیلیگراف کا ڈائرکٹر ہے حقیقی بھائی ان کا مدرسۂ دارالفنون کا پرنسپل ہے۔ سب با مروت۔ با محبت صاحبِ ہمت ۳ مہینے طہران میں رہا روز اِن کے پاس پہنچتا تھا۔ اور تحقیقِ الفاظ اور کتابوں کا فیض حاصل کرتا تھا۔ یہ امیر زادے باوجود دستگاہ امارت اور عمرِ جوانی کے ڈکشنریاں لیکر بیٹھتے تھے اور میرے کام میں اِس محبّت سے توجّہ فرماتے تھے گویا اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ ان کی محبّت اور عنایت کی فہرست کہاں تک پڑھوں جس وقت چلنے لگا تو ایک حکمنامہ عام لکھ دیا کہ جس مقام میں کوئی ضرورت پیش آئے تلگراف خانہ میں جانا اِسے دِکھانا۔ اگر وہاں سرانجام نہ ہوسکے تو ہمیں تار دینا۔ اور ہر جگہ سے اپنی خیر و عافیت کی خبر دیتے جانا۔

طہران میں مانک جی صاحب ایک پارسی صاحبِ تحقیق بامُروت۔ بادیانت ہیں۔ انہوں نے قوم کی حمایت اور اعانت

کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہے۔ شہرہائے ایرآن اور بلادِ ہندوستان میں جہاں پارسی ہیں اور اِن کے کام دربارِ ایرآن سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ ان کے متکفل ہیں۔ اور آپس کے تکراروں میں بھی ان کی بات ہمیشہ تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کا ایک معقول دفتر ہے۔ اور دو منشی نوکر ہیں تصنیف بھی کچھ نہ کچھ چلی جاتی ہے۔ شاہ کی کمال مرحمت اِن کے حال پر مبذول ہے۔ میں ان سے اکثر ملتا تھا اور فوائد علمی حاصل کرتا تھا۔ اُنہوں نے میری محنت اور شوقِ تحقیق کی حد سے زیادہ قدردانی کی۔ ایک سپاس نامہ دیا جسے میں اپنے لئے فخر کا قبالہ سمجھتا ہوں۔ وہ ضروریاتِ مُسافرت میں بھی اکثر مدد کرتے رہے۔ بازار میں جب اشرفی کے ۱۳ قرآن ملتے تھے۔ وہ پارسی بھائیوں کے پاس بھیج دیتے ۱۷ قرآن آجاتے سو روپیہ کے نوٹ پر بازار میں ۱۰ قرآن بٹا لگتا وہ ۵ قرآن بٹا پر بکوا دیتے۔

مرزا رضا خان افشار بگشلو سے ملاقات ہوئی۔ دبیرانِ وبیر اِن کا خطاب ہے اور دولتِ ایران کی طرف سے اسلامبول میں سرترجمان ہیں۔ انہیں لغاتِ فارسی پر عبورِ کامل ہے۔ فرنچ اور ترکی بھی خوب جانتے ہیں۔ کوشش کر رہے ہیں کہ فارس میں فارسی خالص کا رواج عام ہو جائے۔ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن ان کی کوشش میری رائے ناقص سے ایک جز میں اختلاف کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج ہی سب کو مستعد ہونا چاہیئے کہ عربی لفظوں کو زبانوں سے کھرچ ڈالیں اور فارسی قدیم کو جاری کر دیں میں نے کہا کہ علما کا فرقہ بالکل مخالف ہمارا ہے اور پبلک نے ابھی ہمارے مطلب کو سمجھا نہیں۔ اگر دفعتاً کُل تصنیفات اور عام کارروائی اِس پابندی کے ساتھ جاری ہوئی تو پبلک گھبرا جائے گی اور حق بجانب اُن کے ہوگا۔ کیونکہ صدہا لفظ فارسی کے ہیں کہ زبان سے بالکل محو ہو گئے ہیں۔ اُن کی جگہ

الفاظ عربی کارروائی کر رہے ہیں۔ ہزاروں کے لئے لفظ فارسی
ہیں مگر مستعمل نہیں۔ ہر شخص ادنلے اونٹے کام میں لفظ لفظ کیلئے
ڈکشنری سے مدد لے یہ ناممکن ہے۔ نہ دیکھیں تو کام بند۔ ایسی
حالت میں علما کہ قومی رقیب ہمارے ہیں فتح یاب ہو جائینگے
اور ہمارے کام میں خلل عظیم واقع ہوگا۔

میری رائے ناقص یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے الفاظ
عربی کی جگہ فارسی الفاظ رکھو اور وہ رکھو جو خاص و عام کے
کانوں کو اب بھی مانوس ہیں۔ جس عربی لفظ کی جگہ اصل لفظ
فارسی کا نہ ملے وہاں فی الحال عربی رہنے دو یا مطلب کو کسی
اور پہلو سے فارسی کے مانوس لفظوں میں ادا کر دو۔ جب
اہل ملک کو ہمارے ارادہ کی مصلحت معلوم ہو گی اور حب الوطن
کی گرمی دلوں میں دوڑ جائے گی تو سب خود بخود ہمارے
ارادہ پر متفق ہو جائیں گے۔ ہمیں اس مصلحت کے پھیلانے میں

اخباروں سے بھی مدد لینی چاہیئے۔ اور شاہ کی عالی پیشگاہ میں
بھی اس عرض کو پہنچانا چاہیئے۔ کیونکہ دارالتصنیفِ شاہی میں
بھی طرزِ عبارت کی اصلاح پر نظر ہے۔ اس کے جواب میں
مرزا صاحب نے فرمایا کہ ہم کو اپنے کام میں باستقلال مصروف
ہونا چاہیئے۔ خواہ کوئی مانے خواہ نہ مانے۔ الف بائے بہروزی
اور پیروز (اصل) اپنے دو رسالے انہوں نے کتب خانہ آزاد
کے لئے مرحمت فرمائے۔

طہران بلکہ تمام ایران میں کوئی شاعر بالاستقلال نہیں جو
اس فن کا نشان گاڑ کر بیٹھا ہو۔ اور یہ سند ہے اس امر کی کہ
جس قدر تہذیب بڑھتی ہے۔ شاعری گھٹتی ہے لسان الملک
(مصنف ناسخ التواریخ) کے بیٹے قصیدہ خوب کہتے ہیں۔ اصول
وفروع سے باخبر۔ عربی و فارسی کے لوازمات سے آگاہ طبیعت
موزون و مناسب۔ اور کلام نہایت زبردست ہے۔ مگر

برسوں میں جب دل چاہتا ہے کوئی قصیدہ لکھ لیتے ہیں۔ نثر بھی خوب لکھتے ہیں مگر وہی طرز قدیم میں الفاظ عربی سے لغت بازی اور لفاظی کرتے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہوگا کہ دارالترجمہ اور دارالتصنیف میں شامل نہیں۔ باپ کا وظیفہ پاتے ہیں۔ ناسخ التواریخ کی تکمیل کرتے ہیں اور جو اپنی طبیعت صلاح دیتی ہے لکھے جاتے ہیں۔

مرزا فروغی دارالترجمہ کے سرترجمان۔ فرنچ زبان میں ماہر ہیں۔ قصیدہ اور غزل دونو خوب کہتے ہیں مگر بالاستقلال اس کام کو لیکر نہیں بیٹھے۔ سبب کیا؟ وہی نکتہ۔ کہ شاہ۔ دربار شاہ اور جو اہل فہم ہیں تہذیب سے اثر پذیر ہو کر علوم و فنون کے خواہاں ہو گئے ہیں۔ پھر کس کی امید پر شاعری سے نکاح کرکے بیٹھیں۔ مرزا مشتری مشہدی طہران میں موجود ہیں۔ فصیح شاعر ہیں۔ زبان عربی میں پوری مہارت نہیں رکھتے اور علوم میں

بھی وہ رتبہ نہیں۔ قصیدہ اور غزل کم لکھتے ہیں۔ ہجو اور ہزل پر طبیعت زیادہ مائل ہے۔ خوش طبع۔ خوش صحبت۔ شگفتہ مزاج یہ ساری خوشیاں بعض اُمرا کی قدردانی سے نبھی جاتی ہیں نہیں تو اللہ ہی اللہ ہے۔

مجھے طہران میں ٹھہرنے کی بڑی ضرورتیں دو تھیں۔ اول کتابیں۔ دوسرے تحقیقاتِ الفاظ اور ان کاموں کے لئے جس قدر توقف ہو تھوڑا تھا شوق کی پیاس کسی طرح نہ بجھتی تھی۔ جاڑے کا موسم اور بیماری اس توقف کے لئے خوب مددگار ہوئے۔ ۳ مہینے بڑی کوشش سے کام میں مصروف رہا۔ جب بڑا اور چھوٹا دونو چلّے گذر گئے تو میں گھبرایا کہ رخصت تھوڑی رہ گئی اور رخصت بھی ہو تو اڑھائی روپیہ روز کٹ رہا ہے۔ آخر جب سب سے اخیر برف پڑ چکی تو میں شوق کا زاد راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشہدِ مقدس کو روانہ ہوا۔ ۶ منزل

چل کر شہر سمنان میں پہنچا۔ کتابوں میں دیکھا تھا کہ شعر سمنان اور انار سمنان یہاں کا تحفہ ہے۔ اور ہندوستان میں اپنے محقق اور معتبر دوستوں سے سنا ہوا تھا کہ مرزا الیغما جس کی تحقیقِ زبان اور زورِ طبیعت کا چند سال پہلے جواب نہ تھا۔ اُس کا ایک گھر سمنان میں بھی ہے۔ شہر میں جا کر دریافت کیا معلوم ہوا کہ منجھلا اور چھوٹا بیٹا زندہ موجود ہیں۔ دیکھا تو دونو ایک دکان میں بیٹھے برنجی حقے گھڑ رہے ہیں اور چلمیں چرخ پر اُتارتے ہیں۔ بہت افسوس کیا۔ ع

میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز

میں نے سنا ہوا تھا کہ مرزا مرحوم نے ایک کتاب فنِ لغت میں بھی لکھنی شروع کی تھی۔ دریافت کیا۔ لڑکوں بیچاروں کو کیا معلوم۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو ہمارے بڑے بھائی کی تصنیف تھی۔ مجھے زیادہ افسوس آیا اور کہا خیر باپ کے مال پر بیٹے

نے تصرّف کیا تو باپ کی خوش نصیبی۔ بشرطیکہ لیاقت کیساتھ ہو۔

پانچویں دن **دامغان** کو اُس سے بدتر حالت میں پایا **شاہ رود** بدترین بدتر۔ شاہ رود سے داہنے ہاتھ ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر شہر **بسطام** ہے جو کبھی حضرت بایزید بسطامیؒ کا وطن تھا۔ نام کی محبّت نے اُدھر کھینچا۔ فقط ایک گانوں باقی رہ گیا ہے **سبزوار**۔ فقط بزرگوں کی زیارت گاہ باقی رہ گئی۔ **نیشاپور** کا بڑا خیال تھا۔ اس پر بڑا رونا آیا تمام خرابی اور کھنڈر پڑے تھے۔

یہاں سے چوتھی منزل میں مشہدِ مقدّس کی زیارت سے مشرّف ہوا۔ ۱۲ دن مقام کیا۔ حالات بیان کروں تو ایک ضخیم کتاب مرتّب ہو مختصر کہتا ہوں کہ سلاطینِ سلف سے جو دیہات اور املاک جاگیر چلے آتے ہیں وہ اب تک جاری ہیں۔ کوئی بادشاہ انہیں گھٹا نہیں سکا۔ بڑھانا اپنی سعادت سمجھا۔ آمدنی

ان کی ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ سے کم نہیں۔ علماء و طلباء کے مواجب غرباء کے وظائف۔ وظیفہ خواروں کا کھانا روزانہ جاری ہے ہر زائر ۱۵ دن حضرت کا مہمان ہوتا ہے اور ہندی کے لئے میعاد نہیں۔ جب تک رہے باورچی خانہ حضرت سے کھانا کھایا کرے۔ تقریباً ۳۰۰۔ آدمی روز کھانا کھاتے ہیں۔ ایک رکابی پلاؤ کی۔ ایک روٹی۔ ساتھ سالن۔

کتاب خانہ جو روضۂ حضرت سے متعلق ہے کتب عجیبہ و غریبہ سے علوم و فنون کا خزانہ ہے۔ سلاطین و امرائے سلف نے عمدہ عمدہ نایاب کتابیں بھیج کر ذخیرۂ آخرت جمع کیا ہے۔ ان کی فہرست لایا ہوں۔

یہ مقدس مقام ایران ترکستان افغانستان ہندوستان کی تجارت کے لئے بیٹھک ہے اِس لئے کاروانسرائیں آباد۔ بازار بارونق۔ خیابان بالا۔ خیابان پائیں دو بازار طولانی اور

وسعت میں نہایت دلکشا ہیں۔ بیچ میں نہر جاری ہے۔ دونوں طرف مالدار دُکاندار اور دُکانیں اسباب سے مالا مال ہیں۔ (جسے ہم سڑک کہتے ہیں وہاں خیابان کہتے ہیں) یہاں غلّہ کی ارزانی بلکہ ہر جنس کی فراوانی قابلِ تعجب ہے۔ لطافتِ ہوا کا یہ حال ہے کہ نوروز ہو چکا تھا مگر بازاروں میں اگلے برس کے انگوروں کے خوشے آویزاں تھے۔ بعضے جھڑ گئے تھے بعضے صاف اور درست تھے۔

اکثر شاہوں اور شاہزادوں کی قبریں دیکھی گئیں۔ ہارون رشید سر حلقۂ خلفائے عباسیہ گنبدِ اقدس میں سوتے ہیں۔ نادر کی قبر دیکھ کر عبرت ہوئی۔ اللہ اکبر وہ نادر جس کی تلوار کی امان نہ تھی۔ جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے لشکر بھوس کی طرح اُڑتے تھے وہ ایک ٹوٹے چبوترہ پر پڑا ہے۔ وہاں قپانخانہ ہے اسباب تجارت تُلا کرتا ہے (قپان بڑی ترازو)۔

علما میں شیخ بہاء الدین عاملی۔ شیخ حرِ عاملی۔ شیخ طبرسی رحمہم اللہ مدفون ہیں۔ اِن بزرگوں کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھی اور کتبوں کی نقلیں لیں۔ شیخ بہائی علیہ الرحمۃ کی قبر پہ روز دو تین دفعہ فاتحہ کا موقع حاصل ہوتا تھا۔ شعرا میں فردوسی اور اسدی طوسی کا نام لینا ضرور ہے کہ وہیں مدفون ہیں اِس متبرک اور مقدس مقام میں بارہ دن مقام کیا۔ یہاں سے ہندوستان کے دو رستے ہیں۔

(۱) براہ نیر دو کرمان بندر عباس میں پہنچتا ہے۔ تمام رستہ صاف سپاٹ ناآباد ریگستان ہے۔ بندر سے جہاز میں بیٹھے اور کراچی میں آن اُترے۔

(۲) ہرات اور قندھار سے کوئٹہ میں آکر ریل میں بیٹھے اور لاہور میں داخل۔ میں نے سُنا کہ مشہد سے آٹھویں دن ہرات اور ہرات سے ۱۲۔۱۴ دن میں قندھار۔ قندھار سے ۵ دن میں کوئٹہ پہنچتے ہیں۔ البتہ افغانوں کی طرف سے رستہ میں خطر ہے

اِس لئے سوداگر بندر کے رستہ آتے جاتے ہیں۔ یہ بھی سُنا کہ امیر صاحب نے اب اپنے مُلک کا بندوبست ایسا چُست اور درست کیا ہے کہ آج تک کبھی نہیں ہوا تھا۔ مَیں نے بندرعباس کے رستہ میں طول مسافت دیکھا اور کاروان بھی موجود نہ تھا۔ ۱۵-۲۰ دن کا انتظار نظر آتا تھا۔ امیر صاحب کے عدل اور انتظام پر یقین کرکے توکّل بخدا روانہ ہوا۔

ہرات کے رستہ میں ہمارا کاروان شتری تھا۔ تیسری منزل میں نیند نے مجھ پر غفلت کا شبخون مارا۔ اُونٹ سے گر پڑا۔ ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ قدرتِ الٰہی نے جرّاحی کی۔ آپ ہی جُڑ کر اچھّی ہوگئی۔ گرہ اب تک موجود ہے۔

آج سے چند سال پہلے یہ رستہ ترکمانوں کے سبب سے ایسا خطرناک تھا کہ ہر کاروان کے ساتھ ایک دستہ فوج کا اور چند توپیں مشہد سے آتی تھیں۔ ہرات سے امیر کی فوج

جاتی تھی۔ میانِ راہ سے کاروان کو اپنی سپردگی میں لیکر ہرات میں پہنچاتی تھی۔ جب سے کہ فوج سرکاری ہند سے براہِ بلوچستان حدبندی کے لئے گئی ہے۔ روسیوں نے ترکمانوں کو روکا۔ اب دن رات کچھ پرواہ نہیں۔ مسافروں کی آمدرفت جاری ہے۔

راہِ مشہد اور ہرات میں جام مولانا جامی کا وطن[1] آیا۔ ایک ویران قصبہ رہ گیا ہے۔ یہاں حضرت شیخ جام کی تربت ہے اُس پر شاہ عباس نے ایک عمارت عالیشان بنوائی ہے میں بھی گیا اور فاتحہ پڑھ کر داخلِ ثواب ہوا۔ اُس کے ایک کتابہ سے معلوم ہوا کہ میر معصوم بھکری نے اِن کے مزار کو سنہ۱۰۰۰ میں سرِنو تعمیر کیا ہے۔ میر کا نام دیکھ کر دل ایسا خوش ہوا جیسے غربت میں کوئی دوست مل گیا۔ کیونکہ میر کی اور میری دربار اکبری کی ملاقات تھی (یہ بھی امراء اکبر شاہی میں سے تھے) خود تاریخ قندھار

---

[1] مولوی جامی کی ولادت گاہ موضع خرجرد علاقہ جام ہے۔

کے مصنف اور طبقاتِ اکبری میں نظام الدین بخشی کے ساتھ شریک تھے۔ اکبر کی والدہ شیخ احمد جام کی اولاد تھیں عجب نہیں کہ اکبر کے حکم سے۔ یا خود بنوا کر حقِ نمک ادا کیا ہو۔

جس دن میں ہرات میں پہنچا اُسی دن نائب کوتوال آیا اور کہا کہ آپ کو سپہ سالار کے پاس چلنا ہو گا۔ میں نے سبب پوچھا۔ وہ نیک نیت اشراف فرقۂ قزلباش سے تھا اس نے کہا کہ مقامِ تردّد نہیں ہر مُسافر کو جانا پڑتا ہے۔ بعد ظُہر میں آؤنگا اور آپ کو لے جاؤں گا۔ چنانچہ بموجب وعدہ کے آیا اور لیجا کر فرامرز خان سپہ سالار کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے پوچھا۔ راہداری ہے؟ مرزا عباس خان وکیل مختار سرکاری حاضر باش مشہد کا مُہری تذکرہ میرے پاس موجود تھا۔ حاضر کیا اُنھوں نے پڑھوا کر سُنا اور کہا کہ یہ مُہر اصلی ہے۔ میں نے کہا کہ حضور کے سامنے سندِ اصلی کو پیش کرتے ہوئے ہاتھ کانپتے ہیں

جعلی کاغذ کون پیش کرسکتا ہے۔ کہا۔ بہت خوب تم یا بو لو اور روانہ ہو جاؤ۔ ایک فقیر اور ایک پاگل سا آدمی تھا وہ بھی نو وارد مسافر تھے پیش ہوئے۔ ایک کے پاس کاغذ راہداری تھا۔ اُسے حکم ہوا کہ روانہ ہو جاؤ۔ دوسرے کے پاس نہ تھا۔ وہ بخارا سے آیا تھا۔ حکم ہوا کہ جدھر سے آئے ہو اُدھر ہی چلے جاؤ۔ شہر ہرات شاہانِ گذشتہ کا عیش باغ تھا۔ لیکن ۵۰۔ ۶۰ برس سے اس پر ایسی نحوست کا ستارا آیا ہے کہ سلطنتوں کے انقلاب نے گھُڑ دوڑ کا میدان بنا دیا ہے میں نے اس کی عماراتِ قدیم کا حال مختلف کتابوں میں خصوصاً تاریخِ ہرات میں دیکھا ہوا تھا۔ جن مقاموں کے حالات پڑھ کر قدرتِ خدا یاد آتی تھی۔ اب صفاً صفا ہو گئے۔ بڑے بڑے عالم اور نامی مُصنّف۔ اُن میں سے امام فخرالدین رازی مُصنّف تفسیر کبیر۔ ملا حسین کاشفی صاحب تفسیر حسینی غرض کہاں کہاں کے

نام لوں کہ شاہانِ با اقبال کی قدر دانی سے وہاں آ کر جمع ہوئے تھے۔ سب وہیں پیوند خاک ہو گئے ہیں۔

ایک عالیشان گنبد کے اندر جو کہ اب کھنڈر پڑا ہے۔ ۶ تعویذ برابر دیکھے۔ ان کی منبت کاری کو مرصع کاری کہنا چاہئے۔ ان میں امیر تیمور کے کئی بیٹے اور پوتے پڑے سوتے ہیں۔ وہیں سلطان حسین بائقرا مدفون ہے۔ انہی میں گوہر شاد بیگم تیمور کی بہو ہے جس کی مسجد مشہد مقدس میں ہے اور عجائب عمارات عالم میں شمار کی جاتی ہے۔ اِن سب کے کتبے نقل کر کے لایا ہوں۔

شہر سے ۴-۵ کوس کے فاصلے پر خواجہ ابوالولید کا مزار ہے بہت لوگ زیارت کو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ اوائل اسلام میں تشریف لائے تھے۔ تاریخ سے معلوم ہوا کہ احمد ابو رجا انکا نام تھا۔ ظاہر و باطن کو صلاح حال اور علم و کمال سے آراستہ کیا تھا اور حدیث میں مہارت کامل رکھتے تھے۔

گاوزگاہ شہر سے ۳-۴ کوس پر مشہور مقام ہے اور اکثر علما
و اُمرا کی قبریں وہاں ہیں۔ خواجہ عبداللہ انصار کا مزار بھی وہیں
ہے۔ وفات۔ تاریخِ فوت ہے۔

امیر دوست محمد خان اور سلطان جان جو محمد عظیم خان
امیر کے بڑے بھائی کا بیٹا اور خود امیر کا داماد تھا اور ۲۵ برس
حاکمِ ہرات رہا وہیں مدفون ہے۔ اُس کی بیوی یعنی امیر کی
بیٹی کی قبر بھی وہیں ہے۔ امیر نے فوج کشی کر کے ہرات لیا
نواسا اُسی لڑائی میں مارا گیا وہ بھی وہیں دفن ہے پھر آج
سلطان جان مر گیا۔ کل ہرات فتح ہوا۔ آج ہرات فتح ہوا
کل امیر مر گئے۔ دونو ہمت کے پورے۔ اُس نے جب تک
دم میں دم رہا ہرات نہ چھوڑا۔ امیر نے جب تک ہرات نہ لیا
جان نہ دی۔

مولانا جامی کی قبر کو جا کر دیکھا۔ احاطہ ٹوٹا پھوٹا پڑا ہے۔

قبر بڑی عریض و طویل ہے۔ کسی زمانہ میں تعویذ قبر اور دو رِ قبر سنگِ مرمر کی سلوں پر بہت دُعائیں اور غزلیں عمدہ خط میں منقوش تھیں۔ اب سب ایک ڈھیر پتھروں کا ہے کوئی شعر کا مصرعہ پڑھا جاتا ہے باقی اللہ اللہ۔ ان کے شاگرد عزیز ہمدم کی قبر بھی وہیں ہے۔ ہمدم اِسے کہتے ہیں کہ مرکر بھی جُدا نہ ہو۔

مَیں نے ہرات میں آتے ہی کارواں کی تلاش شروع کردی تھی۔ چنانچہ چوتھے دن ایک قافلہ باشی سے گفتگو ہوگئی اور اُس نے کہدیا کہ پرسوں روانہ ہوجائیں گے۔ لیکن افسوس کہ کل اور پرسوں میں ۲۸ دن کامل گذر گئے۔ یہاں مجھے ایک ایک گھڑی پہاڑ تھی۔ اور جو سب سے زیادہ مشکل تھی وہ یہ تھی کہ بچہ سے لیکر بوڑھے تک۔ اور بہادر سپاہی سے لیکر بُڑھیا عورت تک ہر شخص سوال کرتا تھا۔ اور سوال میں سوال کرتا تھا پھر آنکھیں بدلتا تھا اور کہتا تھا کہ کہاں سے آتے ہو؟ کیوں

آئے ہو؟ کس رستہ آئے ہو؟ کیا لائے ہو؟ کتابیں کیوں لائے ہو؟ اتنی کتابیں کیوں لائے ہو؟ انہیں کیا کروگے؟ یہ کیا کیا کتابیں ہیں؟ کس کس علم کی کتابیں ہیں؟ تم اس رستہ کیوں آئے؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ کس رستے جاؤگے؟ اُس رستے کیوں جاتے ہو؟ الٰہی تیری پناہ۔ ناک میں دم آجاتا۔ جل جل جاتا۔ اور کچھ نہ کرسکتا۔ ہزار رحمت ہے ملکِ ایران پر کہ مہینوں وہاں رہا۔ جابجا پھرا۔ اور سب سے ملا جلا۔ ہر قسم کی بات پوچھتا تھا اور لکھتا تھا۔ وہ بتاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ کسی بات کا شبہ دل میں نہ لاتے تھے۔

قندھار کا رستہ جسے ہم ۱۲-۱۴ منزل سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ ۲۶ دن میں کاٹنا پڑا کیونکہ تمام ملک ویران پڑا ہے۔ رعایا صحرا نشین ہے۔ جہاں پانی دیکھتے ہیں کمّل تان تان کر بیٹھ جاتے ہیں اپنی ضرورت کے بموجب کچھ بوتے ہیں۔ وہی اٹھاتے ہیں

اور جہاں چاہتے ہیں بیٹھ کر کھاتے ہیں تاکہ مالیہ نہ دینا پڑے۔
ہمارے قافلہ میں ۱۰۲ یابو اور گدھا تھا اور متفرق مسافر الگ
جدھر ہرا میدان اور آب رواں سنتے تھے اُدھر جاتے تھے۔
اگرچہ رستہ میں پھیر ہو۔ اور جہاں ہری گھاس پاتے اُتر پڑتے
اگرچہ معمولی مسافت سے کم طے کی ہو۔

سب نے کھانے کے سامان باندھ لئے تھے اور جہاں
غجدی نشین ملتے تھے۔ اُن سے پاتے تو آٹا گھی۔ گھوڑوں اور
گدھوں کے لئے جَو لے لیتے تھے۔ مجھ جیسے لوگوں نے سُوئیاں
انگشتانے۔ کنگھیاں۔ سُرمہ۔ کالی مرچیں۔ سونٹھ شہر سے مول
لے لی تھی۔ اُن سے روٹی۔ دُود۔ دہی۔ گھی۔ چھاچھ وغیرہ
مِل جاتا تو مول لے لیتے تھے کیونکہ وہ پیسوں سے لین دین نہیں
کرتے۔ اشیائے مذکورہ سے مبادلہ کرتے ہیں۔ ایک آدھ
روپئے سے بھی سَودا کر لیتے ہیں کیونکہ ۳-۴ سیر آٹے یا جَو سے

زیادہ جنس بھی نہیں دے سکتے۔ میرے پاس پکانے کا سامان نہ تھا اس لئے بہت سی روٹیاں پکوا کر ساتھ لے لی تھیں۔ وہ پانچویں دن سڑ گئیں۔ انہیں سکھایا۔ ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا وہ بھیگ گئیں۔ جہاں موقع ملا پھر پکوائیں۔ اور ۱۰-۱۰-۱۵-۱۵ دن کی سوکھی پانی کے گھونٹوں سے کھائیں۔ اور لوگ مل جل کر کھاتے پکاتے چلتے تھے۔ گھی چاول آٹا وغیرہ ساتھ بندھا تھا مجھے کھانے پانی کو ہاتھ نہ لگانے دیتے تھے کہ ناپاک ہو جائے گا کئی جگہ لوگ پتھر لیکر مارنے کو کھڑے ہو گئے کہ کافر ہے۔ باوجود اس کے جب میرے پاس دودھ۔ دہی وغیرہ کھانے کی چیز ہوتی اور میں دیتا تو لے بھی لیتے۔ اس سے اور اکثر باتوں سے مجھے ثابت ہوا کہ یہ سختی ان کی کسی سبب سے نہ تھی۔ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ روپے والے ہیں۔ انہیں جس طرح دبا کر لے سکیں لینا چاہیئے۔ بہانہ ہاتھ آئے تو مار بھی ڈالیں۔ البتہ

حکام اور سرداروں کی مروّت اور محبت ہر جگہ قابلِ شکریہ ہے اور یہ دلیل ہے اِس بات کی کہ امیر صاحب بذاتِ خود دولتِ انگلشیہ کے ساتھ اتحادِ صلی اور رعایائے انگریزی پر شفقتِ دلی رکھتے ہیں۔

قندھار میں پہنچ کر ۵ دن ٹھیرنا پڑا۔ یہاں بھی وہی قباحتیں موجود تھیں۔ راہ چلتے آدمی روک لیتے اور پوچھتے "بیا بیا۔ بنشیں۔ با تو گپ زنیم" میں کہتا۔ مسافر ہستم کار دارم معاف دارید۔ راہ چلتے پکڑ لیتے اور کہتے "از کجا آمدی بہ کجا میروی" ایک دن دل جل گیا۔ دو شخص بازار میں ملے اور یہی سوال کیا۔ میں نے کہا "از ہند آمدہ ام باز بہند میروم" پھر پُوچھا "چرا آمدی" مجھے بھی غصّہ آگیا۔ میں نے کہا "تو بگو کہ چرا می پُرسی" ایک نے میرا بازو پکڑ کر کہا "نمیدانی ما می توانیم۔ تُرا بگیریم و پیشِ امیر صاحب ببریم۔ تو جاسوسِ فرنگ ہستی۔ میں نے

کہا "خیلے خوب۔ ما می گوئم۔ امیر صاحب مسافر ہستیم بملکِ شما آمدیم۔ نمکِ شما را خوردیم آرام یافتیم۔ دُعا می کنیم۔ می رویم اینہا ہستند کہ حالا بخیر خواہی شما دم می زنند۔ فوجِ فرنگ می آمد ودر او میروند۔ نوکری می کنند۔ یک تخم مُرغ بہ ہر یک ما کیان بہ عار می فروشند۔ باز وقتیکہ ایوب خان می آید بہ کفر شما فتویٰ می نویسند"۔ جب یہ میں نے کہا تو ایک نے دُوسرے کی طرف دیکھ کر کہا "گُم کنید"۔ مجھ سے کہا "برو برو"۔ ایک اور شخص سامنے سے آتا تھا۔ مجھے ٹال کر اُس سے بات کرنے لگے۔ مَیں نے ہنس کر کہا "حالا اینہم بفرمائید کہ اسِم شریف شما چیست" غصہ ہو کر کہا "برو برو۔ بابا برو"۔ میں نے اصرار کیا تو نام بتائے خدا جانے صحیح تھے یا غلط تھے۔ میں نے کہا۔ شما بکدام محلہ می نشنید اُس تیسرے شخص نے اُن سے پُوچھا۔ "ایں چہ بلا ست"؟ پہلے نے کہا "چہ بگویم۔ ہماں خرس ست کہ من میگذارم او نمی گذارد"۔

غرض ۵ دن وہاں رہ کر ۱۰ کی جگہ ۱۲ رُپے کرایہ کے دیئے اور کوئٹہ کو روانہ ہوا۔ کیونکہ جانتا تھا اڑھائی روپیہ روز کٹ رہا ہے۔ راہ کا حال کیا کہوں۔ وُہی بلائیں ساتھ تھیں۔ خُدا خُدا کر کے ۵ دن کا راستہ ۱۱ دن میں طے کیا۔ کوئٹہ میں پہنچ کر شکرِ خُدا بجا لایا۔ دوسرے دن ایک چھکڑا کرایہ پر کیا۔ اُس میں کتابیں لادیں۔ آپ بچھونے بچھا کر اوپر بیٹھا۔ دو دن ایک رات میں رندلی پہنچا۔ وہاں سے ریل میں بیٹھ کر حاضرِ خدمت ہوا ؂

تمام شد

روزنامچہ

حضرت آزاد

روزنامچہ

بندہ آزاد خانماں برباد تباہی دہلی کے بعد کئی سال تک سرگردان پھرتا رہا۔ جب کئی برس کے بعد قسمت نے قرار پکڑا۔ اور اتنی فرصت ملی کہ اپنے حال پر افسوس کروں تو سب سے زیادہ افسوس مجھے اس کتب خانہ کا تھا جو دو پشت سے میرے بزرگوں نے جمع کیا تھا۔ اور میں نے بھی ہمیشہ اسکے بڑھانے اور آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ رنج ہردم تازہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک کتاب کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور یونیورسٹی بھی کسی کو کوئی کتاب نہ دیتی تھی۔ کیونکہ نہ

اسے کسی سے مُروّت تھی نہ کسی قسم کی آمد۔ بعض دفعہ ہر روز ایک نہ ایک نئی کتاب کی ضرورت ہوتی تھی وہ بھی نہ ملتی تھی۔

صاحبِ تصنیف اشخاص جانتے ہیں کہ بعض دفعہ گلستان کا ایک صفحہ دیکھنے کے لئے سکندر نامہ کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور بے اس کے دیکھے آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ اسی رنج میں خدا سے التجا کی کہ اگر مجھے وسعت ملے تو ایک کتب خانہ نظر گاہ خاص وعام میں آراستہ کروں اور جس قدر ممکن ہو ہر فن کی کتابیں اس میں رکھوں کہ کسی قسم کے ضرورتمند کو کسی بد دماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ الحمدللہ کہ روز بروز کچھ نہ کچھ صورت بنتی ہی گئی۔ اِس عالم میں مَیں نے انتظام یہ رکھا کہ جو کچھ خدا دیتا۔ کم اس میں سے خرچ کرتا۔ باقی جمع کرتا تھا۔ خانہ بربادوں کی طرح گذران کرتا تھا اور اپنے مبارک ارادے سے خانۂ دل کو روشن کرتا تھا۔ اِس اثنا میں

کوئی ایسی کتاب جو کم ہاتھ آئے۔ مل جاتی تو لے لیتا کہ ایک دن کام آئے گی۔

اِس قسم کے ارادے حقیقت میں مہماتِ عظیم کی قسم سے ہیں۔ مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ میری کئی عمر کی کمائی بھی اس مراد کو پورا نہ کرے گی۔ اِس لئے سوچتا تھا کہ جو کتابیں اِس مُلک میں نایاب ہیں۔ وہ عرب اور ایران میں ارزاں ملیں گی۔ اِسلئے ایک سیاحت ان ملکوں میں کرنی چاہیئے لیکن عمر گذری جاتی تھی۔ دوسرے مجھ جیسے محتاج شخص کو سب سے پہلے گذارے کا فکر کرنا واجب تھا۔

الحمدللہ کہ اب مئی ۱۸۸۵ء میں ½ پنشن کی مقدار پوری ہوگئی دل برسوں سے آرزومند ہے کہ رخصت لے کر جگہ سے حرکت اور خدا سے برکت لینی چاہیئے۔ اس میں بڑی مصلحت یہ تھی۔ کہ بعض کتابیں زبان فارسی کی (مسودہ) پڑی ہیں کہ ان کی تکمیل

اس کے سوا ممکن نہیں۔

انہیں دنوں تقدیر سے مجھے چند دل شکن صدمے پہنچے جن میں سے سخت صدمہ ایک جوان بیٹی کی موت تھی۔ جو حقیقت میں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی۔ وہ میری تصنیفات میں میرا داہنا ہاتھ تھی۔ اس کے مرنے سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ اور تصنیفات کا قلمدان اُلٹ گیا۔ یہاں تک کہ اکثر ہوشمندوں کو جنون کا شُبہ ہو گیا۔ پٹیالہ اور لاہور میں اِس کا چرچا بھی ہوا۔ لیکن چونکہ اس سفر میں کئی مقاصد اہم بھی آ گئے۔ اور خاکِ وطن کو سفر کا پیوند دکھانا فرض بھی معلوم ہوا۔ اِس لئے رخصت لی۔

رخصت کا مقدمہ سب سے زیادہ سنگین ہے۔ ایک صاحب جو ویسے دیسی لوگوں کی خیر خواہی کا دام بچھائے رہتے ہیں۔ اور حقیقت میں ماہیانِ شبگوں کے شکاری

دوست بن کر دشمنی کرنے والے ہیں۔ وہ بموجب اپنی عادت کے مارج ہوئے۔ چنانچہ کئی مہینہ کی تنخواہ کا نقصان مجھے پہنچایا۔ یا خدا انہیں غیب سے نقصان پہنچا۔ اور دل کا شیشہ چور کر۔ بہرحال آخر ستمبر میں مجھے خاص گورنمنٹ کی تحریر نے حصولِ رخصت سے اطمینان دیا۔ کہ خدا اسے ملک اطمینان کی سلطنت روزی کرے۔

جب سفر کی خبر مشہور ہوئی تو اکثر خویش و احباب نے لکھا کہ صدمہ اور ضعف نے آپ کی جان کو دبا لیا ہے بعض بیماریاں اَور بھی ہَیں اور سفر دُور کا ہَے۔ خالی گھر ہَے۔ لڑکا نوکری پر ہَے۔ ہمیشہ کون دوست خبرگیری کرتا ہَے۔ بعض اشخاص نے روکا بھی!

مَیں نے جو ضرورتیں تھیں بیان کیں۔ اُنہوں نے کہا کہ درست۔ درست۔ لیکن تنہائی کسی طرح اجازت نہیں دیتی۔ میں نے

کہا کہ لڑکے کو سروے کی نوکری چھڑوا کر پہاڑ سے بُلایا۔ اس نے ڈیڑھ مہینہ انتظار کیا۔ مگر اس شیطان پر ہزار لعنت کہ میری رخصت میں خلل انداز ہوا۔ اس کی اَور نوکری ہوگئی۔ وہ گھبرایا۔ مَیں نے ناچار جانے کی اجازت دی۔ مگر کچھ بات نہیں۔ پہلے بھی تو کئی سفر تنہائی ہی میں کئے ہَیں۔ اُن میں بے سامانی تھی۔ ڈیڑھ برس مفقود الخبر رہ کر تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ خُدا آسان کرنے والا ہے۔ انتہا یہ کہ زیارت کو جاتا ہوں۔ اس سفر میں ہر رستہ سے زیارت ہوگی۔ اُنہوں نے کہا وہ عالمِ جوانی تھا۔ دل میں ارمان تھے۔ اب صدمہ ہائے عظیم سے دل ٹوٹ رہا ہے اور پھر آخر عمر۔ خدا نے ہر طرح آسایش کے سامان دیئے ہَیں۔ آرام کرنا چاہیئے۔

میں نے کہا سب درست۔ مگر جن ضرورتوں کے لئے مَیں جاتا ہوں۔ مُلک اس کا محتاج ہے اور قوم کو خیال نہیں

لیکن ہو گا ایک عرصہ کے بعد۔ اس سے بہتر ہے کہ میں ہی اس کام کو کر جاؤں خصوصاً فارسی کی جامع اللغات[1] کہ بغیر فارس میں جانے کے اِس کی تکمیل اور اعتبار ممکن نہیں۔

آخر ایک دن ایک شخص نے خدا جانے۔ دل آزاری یا پاسداری سے یہ بھی کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کو جنون ہے مبادا جنگل میں یا جہاز پر اس کا ظہور ہو۔ اس وقت کیا ہو گا۔

ہمّت نے کہا۔ کارِ خیر میں ہمیشہ موانع پیش آیا کرتے ہیں۔ ترکستان و تاتار کے سفر میں لوگوں نے کیا کیا ہوائیاں اُڑائیں نظم اردو کے مشاعروں پر کتنی گالیاں کھائیں توکّلتُ علی اللہ کہکر اُٹھنا چاہیئے۔ بنک میں دس ہزار روپیہ الگ کیا کہ یکم جنوری ۱۸۸۶ء کو جب معیاد پوری ہو۔ تو نواب نوازش علی خان قزلباش دام اقبالہم کے حوالہ کر دے

---

[1] یہ لغت ہر طرح مکمل ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد تیار ہو جائے گی۔ طاہر

وہ مجھے سوداگران ایران کے نام خط تحریر فرما چکے ہیں۔

۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء - ۱۲ ذیحجہ ۱۳۰۲ھ یوم سہ شنبہ ۶ بجے شام کو ریل میں بیٹھ کر کراچی کو روانہ ہوا۔ اور ۲۵ ستمبر یوم جمعہ کو کراچی میں داخل ہو کر اپنے سعید و عزیز شاگرد مولوی عمر الدین ہیڈ ماسٹر مدرسہ کے مکان پر اُترا۔ یہاں معلوم ہوا کہ کل ہی جہاز روانہ ہوا ہے! اور اب پھر جمعہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اگرچہ دل بہت گھبرایا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ رہا اور اُن کی محبتوں نے اس طرح رکھا کہ نہ معلوم ہوا گھر میں ہوں یا سفر میں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

کراچی میں مرزا احسن علی خان صاحب وکیل عدالت سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے مدرسہ قائم کرنے میں کوشش کی ہے۔ بالیاقت شخص ہیں۔ جس طرح امیر ہیں۔ ویسا ہی امیرانہ دماغ بھی رکھتے ہیں۔ اگرچہ سُنّت جماعت ہیں مگر اس طرح بسر

کرتے ہیں کہ اہلِ سنت شیعہ جانتے ہیں۔

مرزا محمد صادق۔ مرزا محمد جعفر مالک مطبع مفرح القلوب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ بالیاقت۔ بامروّت۔ بااخلاق لوگ ہیں جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد مرزا مخلص علی مرحوم اور میرے والد مغفور سے خط وکتابت تھی تو زیادہ متوجہ ہوئے۔ بلکہ مجھے ایک خط مدیر فرنگ کے نام دیا۔ اور میرے ارادے کا حال مفصل دریافت کیا کہ درجِ اخبار کریں گے۔

علی بھائی کے برابر مسلمانوں میں کوئی صاحبِ دولت سوداگر نہیں۔ وہ بہمہ صفت موصوف ہیں۔ وہ بھی اخلاق سے ملے۔ ان کا مذہب شیعہ ہے۔

راہ چلتے کا لطیفہ۔ سکھر سے سوار ہوا۔ راستہ میں ایک جگہ بستی کو سڑک کٹتی ہے۔ وہاں سرحد کے کئی سو پہاڑیوں کا انبوہ تھا۔ سب کو گاڑیوں میں بھر دیا۔ ان کی زبان میں اکثر الفاظ

فارسی کے معلوم ہوئے۔ پوچھا تو کہا کہ ہم مکرانی ہیں۔ سی کی ریل پر کام کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ کنج مکران کا ملک کتابوں میں دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یہ ایک خشکی کا رستہ ہے۔ جدھر سے کسی وقتوں میں کئی کئی دفعہ اسلام کا لشکر ہند میں آیا تھا۔ آج میں اس کے ہمسایہ میں بیٹھا مکرانیوں سے باتیں کر رہا ہوں۔ ایک شخص کے قیافہ پر ذرا انسانیت اور بات میں سلاست معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ رعایائے کدام بادشاہ ہستند۔ اس نے کہا۔ قیصر ناصرالدین شاہ میں نے کہا۔ شما نوکریِ فرنگ می کُنند اُو ناخوش نمی شود۔ اُس نے کہا۔ اُو پروا نمی کُنند۔

۲ اکتوبر ۱۸۸۵ء۔ ۲۲ ذیحجہ ۱۳۰۲ھ یوم جمعہ کراچی سے عربیہ (عرب) جہاز ڈاک میں عے روپیہ کرایہ دیکر سوار ہوا تمام دن جہاز میں گذرا کہ اسباب بہت اُترا اور چڑھایا گیا۔

۴½ بجے قریب شام جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ سب سے پہلے شکر خدا ہے اس نعمت پر کہ مجھے اضطراب دَورانِ طبع اور استفراغ سے لوگوں نے ڈرایا ہوا تھا۔ مگر مجھے اِصلا معلوم نہیں ہوا۔ لیمو۔ انار۔ تربوز وغیرہ اسباب میں موجود تھے۔ اس جہاز پر ۱۔ کپتان۔ ۳۔ افسر معلم۔ ۴۔ انجنیئر۔ ۱۔ ڈاکٹر۔ ایک انگریزی نویس ذمہ دار ہیں۔ جہاز ہمارا اوسط دن رات میں ۲۵۰ میل چلتا ہے۔

آغا عبدالکریم ایک ایرانی سے ملاقات ہوئی۔ یہ مگر ۲۰ برس سے ایران چھوڑ کر بطور سوداگری مدراس رنگون وغیرہ میں رہتے ہیں۔ فی الحال سویز سے کراچی آکر کربلا کو جاتے ہیں۔ فارسی شاعری کا بہت شوق ہے۔ مدح اور مرثیہ کہتے ہیں۔ عربی بھی بولے مگر سواحل کی۔ انگریزی بھی بولتے ہیں مگر جہازی۔ میرا ان کا بستر یکجا ہوا کہ دونوں ایکدوسرے کو غنیمت سمجھتے تھے۔

اِس جہاز پر مولوی عبدالعلی صاحب سورت کے رہنے والے بھی تھے۔ ان کے عیال بھی ساتھ تھے۔ ۳ عفیفہ۔ ایک ۳ برس کا بیٹا۔ ایک یک سالہ۔ ایک کتخدا نوجوان۔ یہ تینوں صاحب بوہرے تھے۔ مولوی صاحب وعظ و نصیحت سے خاص و عام کو ہدایت فرماتے تھے اور خوش اعتقاد مومن تھے۔ مجھ سے وہ اور اُن کے وابستہ کمال محبّت سے پیش آتے تھے۔ رات آرام سے گذری۔ اِس مقام پر اہلِ جہاز اور اس کے ادنےٰ ادنےٰ نوکروں کی تعریف کئے بغیر چلنا۔ اِنصاف پر ظلم کرنا ہے۔ کیونکہ میں نے خوب دیکھا کہ ان لوگوں کی کفائتیں عورتوں کی طرف سے اِصلا منحرف نہیں ہوتیں۔

۳۔ اکتوبر۔ ۲۳ ذالحجہ۔ ہفتہ۔ دن آرام سے گذرا۔ مگر صبح کو ۱/۲ ۷ بجے تک تمام جہاز دھویا جاتا ہے۔ پھر روغن وغیرہ

پکانے کے سبب سے دھواں رہا۔ اِس لئے ایک دو بجے تک تکلیف رہی۔ رات آرام سے گذری الحمد للہ۔

رات کو تمام شب وسط جہاز میں ایک معلم ٹہلتا رہا۔ ایک دیسی عرشہ پر کھڑا تھا۔ اور بموجب قاعدے کے گردش دیتا تھا اس کے حساب اور اندازے پر جہاز کی رفتار ہوتی ہے۔ آدھ گھنٹہ میں گھڑیال بجتا تھا اور خاصی آواز دیتا تھا کہ خبردار رہنا۔ آگے عرشہ میں ایک اور خلاصی تھا وہ کہتا تھا۔ کہ مَیں خوب دیکھتا ہوں۔

ایک صاحب کراچی سے سوار ہوئے۔ بوشہر کو جاتے ہیں دوسرے درجہ میں بیٹھے ہیں۔ ہم کالے آدمی کُل پندرہ ہیں۔ تیسرے درجہ میں گذارہ کرتے ہیں۔ مجھے خود بچارے نے دوسرا درجہ دکھایا۔ مگر حب الوطنی نے کہا کہ اتنے روپیہ جمع کر کے کتابیں لو تو ایک خانہ الماری کا آباد ہوتا ہے۔ اِسلئے

تکلیف سے مجھے آرام معلوم ہوئی۔

جہاز پر گھنٹہ کا حساب خدا پر ہے۔ ۱۲ بجے پر آدھ گھنٹے کے بعد ایک آواز پورے گھنٹے پر دو آوازیں۔ ½۱ گھنٹہ کے لئے تین آوازیں۔ . . . چار گھنٹے کے لئے ۸ آوازیں۔ پھر آدھ گھنٹہ کے لئے ایک آواز۔ پورے گھنٹہ کے لئے دو آوازیں . . . . ہمارے ۸ بجے کے لئے ۸ آوازیں۔ پھر اُسی طرح۔ غرضکہ چار چار گھنٹہ کا ایک مجموعہ رکھا ہے۔

۴ اکتوبر ۱۸۸۵ء ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ یوم اتوار۔ نماز کے وقت عرشہ جہاز پہ جا کر ہوا کھانے لگا۔ ذرا روز روشن ہوا تو ایک میمن دُکاندار بندر عباس کا جانے والا بھی آیا۔ اور مجھے بتایا کہ دیکھو گادر جو ایک معمولی لنگر ہے۔ ہمارے دائیں ہاتھ کو پیچھے رہ گیا۔ اور یہ سامنے دائیں ہاتھ پر اسی کے سلسلے کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں بلوچ لوگ رہتے ہیں

پہلے غارت پیشہ تھے۔ اب دولتِ انگلشیہ نے انہیں درست کیا ہے۔

میمن کا نام حبیب دوراجی۔ علاقہ سیتا ور یلاول کا رہنے والا ہے۔ بندر عباس جاتا ہے کہ باد ام انگور وغیرہ میوہ جات خرید کر لائے گا۔ یہ حنفی مذہب ہے مگر ملنسار آدمی ہے۔ شیعوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔

ایک جہاز ٹھیک سامنے سے نظر آیا کہ غالباً مسقط سے آتا تھا۔ مجھے نہ معلوم ہوتا۔ دُور تھا۔ اسی رفیق نے بتایا۔ وہ ساعت بہ ساعت نزدیک آتا تھا۔ آخر ہمارے داہنے ہاتھ کو ہو کر گادر کو چلا گیا۔

تمام دن ہمارے دائیں ہاتھ پر گادر۔ جاسک وغیرہ کی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اگرچہ بات اعتبار کے قابل نہیں مگر کہتے ہیں۔ اس میں فرقہ بام (جنگلی آدمی۔ بن مانس) رہتے

ہیں۔ مرد اکثر غاروں میں رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں اِنسان پہ عاشق ہوتی ہیں۔ جہاں کسی مسافر یا اکیلے دوکیلے آدمی کو پاتی ہیں۔ لے جاتی ہیں۔ اس سے ہوس رانی کرتی ہیں۔ جنگل کے میوے لاکر کھلاتی ہیں۔ تلوے چاٹتی ہیں کہ چل نہیں سکتا۔ خود حیوان مطلق ہیں۔ مگر انسان نرینہ سے ہوس رانی کا مرض ہے ان کے نر ہوتے ہیں۔ مگر وہ نہایت ضعیف اور یہ ایسی قوی ہوتی ہیں کہ وہ کچھ نہیں کہ سکتے وہ انسان سے صاحب اولاد بھی ہو جاتی ہیں۔ آدمی اگر بھاگ کر نکل جائے تو پیچھا کرکے دوڑتی ہیں اور پکڑ لے جاتی ہیں اور نسل بڑھاتی ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص بھاگے۔ مادہ نے تعاقب کیا۔ ایک ندی بیچ میں حائل ہے۔ خوش قسمتی سے وہ قوم پانی سے ڈرتی ہے۔ خوبیِ قسمت سے یہ پار ہو چکا تھا۔ مادہ کنارے پر آکر رُک گئی۔ غائیں بائیں کرکے غُل مچاتی تھی۔ روتی تھی۔

غصہ ہوتی تھی۔ اور بچوں کو اُٹھا اُٹھا کر دے دے مارتی تھی۔ کہ شاید ان کی محبت کے سبب سے چلا آئے۔ مگر وہ بلا سے نِکلا اب کب جاتا تھا۔ کھڑا دیکھتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد بھاگ آیا۔

جہاز ہمارا چلا جاتا ہے۔ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ خلاصی اور نوکران جہاز تاش کھیل رہے ہیں۔ کبھی دو کبھی تین بادبان چڑھا دیتے ہیں۔ رات کو چار بادبان ہو گئے۔ ہوا کم تھی۔ اُتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ دن کو گرمی بشدت رہی۔ رات کو کچھ امن رہا۔ ۵ اکتوبر ۱۸۸۵ء یوم دوشنبہ ۲۵ ذیحجہ ۱۳۰۲ھ صبح مبارک صبح ہوئی۔ سُنا کہ دس بارہ بجے بندر عباس پہنچ جائیں گے۔ میں نے ۷½ بجے تک عرشہ پر جا کر ہوا کھائی بہت خوش آیند تھی۔ پھر آ کر لکھنے میں مصروف ہوا۔ دن کو گرمی ایسی شدت کی رہی کہ چاروں طرف پھرتا تھا۔ اور

کہیں امان نہ پاتا تھا۔ خدا کی قدرت یاد آتی تھی کہ کجا وہ لاہور کی سیر اور سوا سیر برف کُوٹ کر پھانکنی۔ اور دن رات میں تین تین دفعہ تربوز کھانے۔ خوراک میں فقط دہی دُودھ اور کجا یہ عالم اس پر غذا کی بے سامانی الگ ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مظہر العجائب کی شان اس سے بہت عالی ہے۔

ہمراہی ہمارے جو پہلے اوپر آ چکے ہیں۔ کبھی کہتے تھے کہ یہ دستِ راست کو کوہ مبارک ہے۔ یہاں عرب اور کوہستانیوں سے کسی زمانے میں جنگ ہوئی تھی۔ اور عرب کی فتح ہوئی تھی۔ اِس لئے اِس کا نام جبل مبارک رکھا۔ کبھی کہتے ہیں کہ سامنے کوہ سلامہ نظر آتا ہے۔

رات کو گرمی نے سخت تکلیف دی۔ مَیں گھبرا کر اُٹھتا اور بیٹھ جاتا۔ صبح تک یہ ہی حال رہا۔ رات کو مَیں نے دریا میں دیکھا۔ کف جو موج میں یا جہاز سے ٹکرا کر پیدا ہوتے ہیں

ایسے جاتے ہیں جیسے فاسفورس کے بادل بہ رہے ہیں اور اِکا دُکا بلبلے جگنو نظر آتے ہیں۔

مسقط کنارے پر تھا۔ مگر چھوڑ دیا۔

۶ اکتوبر ۸۵ء۔ سہ شنبہ۔ ۲۶ ذیحجہ۔ صبح کو دونوں طرف پہاڑیاں پاس پاس نظر آنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ ٹھیک دست راست پر کوہ ہرمز ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی سمندر کے بیچ میں ہے۔ اس پر آبادی ہے۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ کوہ لاک سے جہاز دور نکل آیا۔ بائیں ہاتھ پر ہاتھ کو چکر دے کر کہتے ہیں کہ تمام کشمیر کا علاقہ ہے۔ سمندر کے کنارے مرزا نظر اللہ۔ شاہِ ایران کی طرف سے حاکم ہے۔

۸½ بجے بندر عباس پر پہنچے۔ یعنی آبادی ہمارے داہنے ہاتھ تھی۔ ہمارے جہاز نے کنارے سے اس قدر

دور لنگر کیا کہ مَیں بلکہ کوئی بھی شہر میں نہ جا سکا۔ دَمقہ ایک چھوٹا جہاز بادی آیا کہ یہاں کے لوگ اسے غرّاب کہتے ہیں وہ انگریزی کمپنی کا ہے۔ ڈاک دینے اور لینے۔ اور (میمن) وہ مال لینے آیا تھا جو بندر عباس کے لئے ہمارے جہاز میں تھا۔

بندر کے ملاح چھوٹی چھوٹی کشتیاں لیکر آئے اور یہاں کے اُترنے والے مسافروں کو اُتار لے گئے چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چند نوجوان لڑکے آئے۔ اور خربوزے خشک انجیر۔ انار۔ ناشپاتی۔ انڈے لائے۔ پھر چند اَور سودے والے آئے۔ مگر سب کی زبان خالص فارسی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے خاکِ ایران شروع ہوتی ہے۔ باوجود اس کے سب کی رنگت کالی یا سانوالی۔ اس کا تعجب نہیں۔ جس ملک میں اس غضب کی گرمی پڑے وہاں تو حبشی پیدا ہونے چاہیئے ہیں۔ خیر جو جہاز آیا تھا۔

اس میں حبشی اور اکثر دو غلے حبشی ہی تھے۔ انار بالکل کھٹے تھے۔ خربوزے بھی مزے میں قابلِ تعریف نہ تھے۔ البتہ بڑے بڑے تھے۔

۱۲ بجے تک مال جہاز سے اُترتا رہا۔ بہت سے ٹھیلے شکر کے تھے۔ کالی مرچ۔ کھوپرہ۔ اور کئی بوجھ تانبے کی چادروں کے تھے۔ یہاں سے ہندوستان کو جانے کے قابل کوئی چیز نہیں۔ مہندی اور سوکے لیمو بغداد کو جاتے ہیں اور کپڑا ان تمام بندروں میں بمبئی سے آتا ہے۔

دو بجے جہاز چلا۔ اور ٹھنڈی ہوا کھلی۔ مگر اس طرح کھُلی۔ گویا اسی کی منتظر تھی۔ ہماری جان میں جان آتی تھی۔ لیکن مشکل یہ کہ عین مقابل سے آتی تھی۔ اگر بادی جہاز ہوتا تو قدم بھر آگے نہ بڑھ سکتا۔ دو خان کی برکت تھی کہ رات کے چار بجے تک جہاز تیر کی طرح ہوا کی چھاتی پر چڑھتا چلا گیا۔ اب شام ہو گئی

میں عرشہ پر ٹہلتا پھرتا ہوں۔

بندر عباس سے ایک مرد عرب شیخ محمد حسین سوار ہوئے بحرین جاتے ہیں کہ روضہ خوانی کریں۔ سلسلہ گفتگو میں مَیں نے سید نعمت اللہ جزائری علیہ الرحمۃ کا ذکر کیا۔ کہا کہ مَیں ان کی اولاد میں ہوں۔

۷ر اکتوبر ۱۸۸۵ء چہار شنبہ ۲۷ر ذی الحجہ۔ میں بموجب معمول کے آخر شب سے عرشہ پر ہوا کھا رہا تھا کہ سفید صبح کے ساتھ بندر لنگہ (لنخہ) کے درخت کناروں پر دکھائی دیئے۔ لنگر ڈالنے کے سامان ہوئے۔ ۶ بجے کے بعد دو کشتیاں اسباب لینے آئیں۔ ۸۔ ۱۰ اسواریاں آئیں کہ بحرین میں اُتر جائیں گی۔ ۲ گھنٹہ اسباب اُترتا رہا۔ ½ ۱۰ بجے جہاز روانہ ہوا۔

لنگہ بندر عباس سے چھوٹا ہے۔ شہر کنارے پر آباد ہے اصلی آبادی کم تھی۔ جہازوں کی آمد و رفت نے سہ چند بڑھا دیا

ہے۔ اس کے بیچ میں کھجوروں کی قطار ہے۔ اس کے پیچھے پھر آبادی ہے۔ مکانات کی ساخت سامنے سے انگریزی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہوادار کھڑکیاں برابر برابر رکھتے ہیں میوہ یہاں کچھ نہیں۔ اہل عرب کے لوگوں کی آبادی ہے۔ اگرچہ ایران کی عملداری ہے۔ مگر حاکم سیّد ہوتا ہے۔ چنانچہ حاکم حال کا نام سیّد نقیب ہے۔ آج کل محرّم کے سبب سے شاہزادہ محمد حسین مرزا بندر عباس سے آیا ہوا ہے! در جب کوئی صورت خاص واقع ہوتی ہے تو کوئی حاکم ایرانی بھی آجاتا ہے۔

گرمی کی شدت ہے۔ ہوا کھل گئی ہے۔ اگر عرشہ پر سایہ ہوتا تو عیش ہو جاتا۔ اب سخت تکلیف میں ہیں۔ میں رات بھر میں کئی بار اوپر اور نیچے گیا کہ مبادا کوئی چیز غائب ہو جائے آدمیوں کی کثرت نے زیادہ تر تکلیف دی۔

حاجی عبدالرسول نام بوشہری معلم جہاز ہوکر نخہ سے آئے ہیں - وہ میرے شریک بستر ہوئے - نجف نام ایک نوجوان خوش مزاج ان کے ساتھ ہے - ایک حبشی دراز قد بھی ساتھ ہے۔ لطیفہ - میں نے حبشی کا نام پوچھا - کہا مہندنی - (ماندنی) میں نے پوچھا مہندنی چہ معنی دارد - ہنس کر کہا - غرض ہیکہ انشاء اللہ می ماند -

حاجی صاحب کاروبار دریا سے خوب واقف ہیں - جو جہاز آتا ہے - بوشہر تک ساتھ ساتھ جاتے ہیں - وہاں سے ان کی بدلی ہو جاتی ہے - یہ معلم راہ کے نیک و بد اور خوف و خطر کے ذمہ دار ہوتے ہیں - اس وقت حاجی صاحب کا قہوہ پیا ہے -

نخہ کے لوگوں کی اصل عربی ہے - بحرین اور بوشہر سے ان کی ایسی آمدورفت ہے جیسے لاہور - امرتسر - جالندھر -

یادِ دلی - میرٹھ -

۸ اکتوبر ۱۸۵۵ء ۲۸ ذیحجہ پنجشنبہ - رات بھی ہوا سخت چلتی رہی کہ عرشہ پر چلا نہ جاتا تھا - جہاز آگے پیچھے اس طرح ہلتا تھا - جیسے کوئی بچہ کو گودی میں لٹا کر بیٹھا رہے - اور زانوؤں کو حرکت دے - اول اول مجھے اس سے نیند آئی مگر پچھلے پہر سے مجھے ضعف شروع ہوا - اور صبح تو ایسا ضعف معلوم ہوا کہ دل و دماغ گھُلے جاتے ہیں - جس وقت دودھ میں چائے ڈال کر گھولی - اور روغنی روٹی بھگو کر پی - اس سے ذرا سہارا ہوا - مگر دل بدمزہ ہو گیا کہ گھی میں کھوپرے کا تیل تھا -

تھوڑی دیر میں بہت بیقراری اُٹھائی - عرشہ پر جا کر پڑا رہا - میں سمجھتے یا تو یک دل تھا یا اب دل بیٹھا جاتا تھا - بارے آنکھ لگ گئی - تھوڑی دیر میں دھوپ آگئی - اُٹھا تو طبیعت

ٹھیری ہوئی تھی۔ نیچے آ کر کئی گھونٹ پانی پیا۔ سہارا سا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر پھرتا تھا مگر حال بیحال تھا۔ لیٹے بیٹھے چین نہ تھا۔ دوپہر کو جھوکے کم ہوئے چند نوالے چاول کے دال کے ساتھ کھائے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے حصّہ کا عرشہ جو جہاز کی ناک سے لگا ہوا ہے۔ اس پر زیادہ جھوکے لگتے ہیں۔ وسط میں کم ہیں بھی وہیں جا بیٹھا اور یہ چند سطریں لکھیں۔

۸-۹ بجے سے ہمارے بائیں طرف دُور دُور کنارے پر اِدھر اُدھر ۱۰-۱۵-۲۰-۴۰ تک کشتیاں متفرق پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس میں غواص (غوطہ خور) موتی ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ پہچانتے ہیں کہ کہاں ہم کامیاب ہوں گے وہیں غوطہ لگاتے ہیں اور قسمت آزماتے ہیں۔ یہاں اکثر سوداگر آتے ہیں۔ یہ ان کی طرف سے اُجرت پر کام کرتے ہیں نصف جولائی سے نصف اکتوبر ۳ مہینہ تک کام ہوتا ہے۔

بحرین اور اُس کے قرب و جوار کے جزائر میں موتی بہت سستے ہوتے ہیں۔ شکارپور وغیرہ کے اکثر ہندو اور بعض مسلمان بیوپاری آتے ہیں اور لے جاتے ہیں۔ بہت بِکری ہند ہی میں ہے۔ اکثر موتی جو یہاں ۱۰-۱۲ روپیہ کو آتے ہیں ہندوستان میں آکر ۲۰۰-۳۰۰-۵۰۰ اور کبھی ہزاروں کا مول پاتے ہیں۔ ۳ بجے ہمیں داہنے ہاتھ پر کشتیوں کے سلسلے دِکھائی دیئے۔ جن کی تعداد ۳۰۰ کہتے ہیں۔

ایک مقام پر داہنے ہاتھ کو لوہے کا چھوٹا سا گنبد۔ اس پر ایک سلاخ۔ اس پر ایک گولا نظر آیا۔ اس کا نام بوئیا ہے۔ علامت ہے اِس بات کی کہ پانی کم ہے۔ جہاز بچا کر لے جاؤ نہیں تو پھنس جائے گا۔

۴½ بجے بحرین پہنچے۔ اول کنارے پر بادبان نظر آنے شروع ہوئے۔ دریا کے کنارے ایک نصف دائرہ میں

آبادی ہے۔ اور آبادی سے الگ ایک قلعہ کئی سو برس کی تعمیر موجود ہے۔ یہاں سے کچھ مال نہیں آیا۔ جہاز سے کچھ مال تو رات کے ۹ بجے تک اُترا گیا۔ کچھ ۸ بجے صبح تک اُترا۔ چاول وغیرہ اشیائے معمولی بھی یہاں سوائے لوز نام ایک ثمر کے کچھ نہیں ہوتا۔ لوز ایک میوہ سُرخ چقندر سا ہوتا ہے۔ اندر گٹھلی۔ مزہ شیریں یا کھٹہ ملیٹھا۔ مزاج معتدل۔

پہلے یہاں عمل ایران تھا۔ بارہ تیرہ برس ہوئے جبکہ سلطان نے قطیف نام ایک جزیرہ قریب کا لیا اور اس کو دولت انگلشیہ کے تفویض میں کر دیا۔ اب دولتِ انگلشیہ کی طرف سے ایک حاکم شیخ عیسےٰ نام ہے۔ وہ حکم کرتا ہے اور مرزا احمد یعنی مرزا عبدالغنی سوداگر بوشہر کا بھتیجا بھی انتظام میں شامل ہے۔ یہ لوگ دولتِ انگلشیہ کی طرف سے ہیں۔

یہ قدیمی اور بابرکت جزیرہ ہمیشہ سے علوم کے باب میں

مشہور ہے۔ علمائے شیعہ میں بڑے بڑے نامی اہلِ تصنیف اپنے فیض کی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔ مَیں اس مقام پر ان کے نام لکھتا۔ لیکن مزا اس کا ہے ان کے حالات اور تفصیلِ حالات کے نہ تھا۔ اِس لئے قلم انداز کرتا ہوں!

۹ر اکتوبر ۱۸۸۵ء ۲۹ ذیحجہ یوم جمعہ۔ ۸ بجے کے بعد چلے بہت سواریاں اُتریں مگر بہت ہی آن چڑھیں۔ ۱۰ بجے تک ہوا ٹھیک تھی۔ پھر ہوا نے جہاز کو اور اُس نے دلوں کو تہ و بالا کر دیا۔ تمام دن اور رات یہ ہی حال رہا۔

۱۰ر اکتوبر ۱۸۸۵ء ۳۰ ذیحجہ یوم شنبہ۔ بہ ساعت یک داخلِ بوشہر شدم۔ الحمدُ للہِ علیٰ ذالک۔

۳۰ر ذیحجہ سے ۷ محرّم تک بوشہر میں قیام رہا۔ آخر دن انتظار کے بعد ایک ایرانی راہوار کرایہ پر کیا۔ اور ۷ محرّم کی شام کو شہر سے نکل کر کارواں (قافلہ) میں شامل ہوا۔ دو گھنٹہ

بعد روانہ ہوئے ۔ تمام رات برابر رستہ چلے ۔ میں گھوڑے پر تنہا چلا جاتا تھا اور شکر سے دل کو تسکین دیتا تھا کہ اگر پیدل چلنا ہوتا تو کیا ہوتا ، ۸ بجے اسفندی میں منزل کی کل ۸ فرسخ چلے ۔ آج معلوم ہوا کہ کوس کے کیا معنی ہیں ابتدا سے آج تک جو لوگ ع

کوسِ رحلت بکوفت دستِ اجل

کے معنی پڑھاتے ہیں انہیں خبر ہی نہیں ۔ کارواں میدان میں پڑا تھا اور دھوپ کی شدّت کہ خدا کا سایہ ڈھونڈتا تھا اور نہ پاتا تھا ۔

دن عجیب پریشانی میں گذرا ۔ اسفندی گاؤں کا نام ہے جنگل کی گھاس سے گھر چھائے ہوئے ہیں اور لوٹنے سے گذران کرتے ہیں پچھلے کو کوچ ہوا ۸ بجے براز گون میں آکر اُترے جگہ کو دیکھ کر عبرت ہوئی یہ وہی مقام ہے کہ جہاں تک

فوج سرکاری راس محمدا کو مُڑی وہاں سے واپس ہو گئی لیکن اس آمد کی علامت باقی نہیں۔

یہ مقام بھی آبادی میں اسفندی سے کچھ کم نہ ہوتا مگر سرائے حشیر نے اُسے عزت دی (نام نہیں لکھا) کہ فرمانروائے شیراز تھے ان کی نیک نیتی نے اکثر فیض عام کے نام سے عمارات عالی شان ملقب کیں۔ ازاں جملہ یہ سرائے ہے اس کی وسعت اور طرز و تراش خوشنمائی میں قابل دیکھنے کے ہے۔ یوم عاشورہ کے سبب سے کارواں نے کوچ نہیں کیا۔

۱۹ اکتوبر ۱۸۵۰ء ۱۰ محرم پیر کے دن دوپہر دن سے پھر روانہ ہوئے راستہ میں کئی کوس تک سخت سڑی ہوئی بارود کی بو آئی معلوم ہوا یہاں مکان نفط یا گندک ہے۔ ۴-۵ گھڑی رات گئے دالکی میں مقام ہوا۔ پچھلے کو پھر اُٹھکر روانہ ہوئے آج کے راستہ میں نشیب و فراز بہت تھا اور کتل بھی بلند تھا

سب مجھے قریب نصف راستہ کے پیادہ چلنا پڑا۔ درہ میں داخل ہوکر رود خانہ ملا کہ اسے ایک بڑی نہر سمجھنا چاہیئے۔ اس پر کسی زمانہ میں پُل تھا۔ وہ اب منہدم ہوگیا۔ چند در شکستہ کھڑے ہیں لیکن امیر مذکور نے جو اس پر پُل بنایا ہے۔ اس پر سے اُتر کر مَیں نے بھی دُعائے مغفرت کی۔ دُور تک اس کے کنارے درست کر دیئے ہیں کہ گھوڑے خچر گدھے وغیرہ محفوظ رہیں۔

درہ میں ہوا ٹھنڈی ہے مگر کب اچھی لگتی ہے کہ طبیعت میں ریزش نے حرارت پیدا کر دی ہے۔ کتل کو بھی اوپر سے پختہ چنائی سے درست کرنا شروع کیا تھا مگر عُمر نے وفا نہ کی۔ کتل پر دو میل چڑھائی چڑھ کر پہاڑ مسطح نہایت خوشنما ہوگیا تھا طبیعت کو بڑی فرحت ہوتی تھی کیونکہ جو ہر ہوا ہی فرحت ہے

اس تمام رستہ میں جھاڑی کے بیر کے درخت بکثرت ہیں اسی واسطے جس گاؤں میں ہم اُترے ہیں اُس کا نام کنار تختہ

ہے۔ یہاں ایک تلگراف خانہ ہے مگر بند پڑا ہے کھجوروں کے درخت بہت ہیں اس کی کھجوریں ادھر بوشہر اُدھر شیراز تک روٹیوں کے بدرقہ ہوتی ہیں اور حقیقت میں عمدہ ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی کھجوروں میں گٹھلی چھوٹی۔ چھوٹی میں بالکل نہیں۔ اسے کتل ملو کہتے ہیں!

۱۲ر اکتوبر ۸۵ء ۱۲ر محرم یوم بدھ۔ پچھلے کو سوار ہوئے۔ تھوڑی دور چل کر پھر ایک رودخانہ شروع ہوا۔ صبح سے پہلے ختم ہو گیا بہت سے اُتار چڑھاؤ کے بعد ایک کتل آیا۔ کل سے چھوٹا تھا یہ رستہ بھی میں نے آدھے سے زیادہ پیادہ طے کیا۔ رات کا پلاؤ ایک پڑیہ میں باندھ کر جیب میں رکھ لیا تھا کتل پر چڑھتے ہی کھایا۔ طبیعت میں عجب قوت اور فرحت ہو گئی۔ قاطرچی کے اصرار سے سوار ہوا سطح پر آتے ہی ایک سرائے ملی اگرچہ نہایت مضبوط ہے اور استوار چنائی ہے

مگر دراور حجرے پست بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے سمجھا کہ بہت پُرانی ہوگی۔ ویران پڑی ہے ہماری منزل ۳ فرسخ کی تھی۔ کمارِج پر اُترتے قاطرچی کوس ڈیڑھ کوس آگے جا کر اُترا۔ آگ پانی کی بڑی تکلیف رہی مگر چیز جہاں چاہو رکھ دو کوئی تھا ہی نہیں جو چُرا لینے کا اندیشہ ہو۔ اسے کُتل کمارِج کہتے ہیں۔

۲۲ اکتوبر ۵۸۵ء ۱۲ المحرّم یوم جمعرات۔

پہر رات نہ گئی تھی کہ کوچ کر دیا ایک کُتل آیا۔ اور تھوڑی چڑھائی کے بعد بہت لمبی اترائی اترنی پڑی۔ صبح ہوتے کازران پر پہنچے۔ قصبہ بہت اچھا ہے۔ ایک چشمہ گھر گھر نہر بہاتا ہے اور کئی جگہ آب آسیا چلتا ہے بہت قسم کے میوے یہاں ہوتے ہیں۔ مگر انار مزخوش لوگ بہت خوشی سے کھاتے ہیں۔ میں نے بھی سیر ہو کر کھائے۔ بیدانہ ہیں مگر اچھے ہیں۔ یہاں سے ہوا میں سردی زیادہ ہوتی ہے اور خاکِ شیراز کا اثر ظاہر ہونے

لگتا ہے۔ باغ نظر یہاں ایک پرانا اور اچھا باغ ہے۔
۳ مہینہ سے ایک صاحب اجازہ جوان عمر شیخ محمد نام نجف کے تحصیل کئے ہوئے فاضل آبدوانی کے شاگردوں میں سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ لوگوں نے رکھ لیا۔ جمعہ و جماعت کا چرچا ہے۔ میں بھی جا کر ملا۔ تین شخص معقول اشراف بیٹھے تھے مجھ سے حال پوچھا۔ بیان کیا۔ ایک شخص ایک بڑی کتاب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ مصاحب ہیں یا صاحب نظر اشراف نے کہا اسرار الشہادت اور شیخ صاحب کو دی۔ گویا منتظر تھے۔ شیخ صاحب نے مجھے دی اور کہا کہ پڑھو۔ میں نے کھول کر ایک جگہ سے پڑھنا شروع کیا۔ ایک لفظ پر انہوں نے ٹوکا۔ میں نے پوچھا تو میں غلطی پر نہ تھا۔ پھر بھی میں سوچنے لگا۔ انہوں نے خود سوچ کر فرمایا کہ شما درست خواندید۔ بخوانید جب میں کتاب رکھ دوں اور کھولوں بس است امتحان تمام شد

مگر خلافِ انسانیت سمجھ کر پھر پڑھنے لگا۔ایک جگہ پھر ایسا ہی موقعہ ملا۔ پھر تیسرا خیر مطلب بھی ختم تھا۔ میں نے کتاب بند کر کے سامنے رکھ دی اور باتیں کرنے لگا۔ فرمایا۔شما زبانِ عربی را خوب ورزیدہ اید۔ رات کو ہماری خاطر سے سب نے مقام کر دیا۔ ۱۴ محرم یہیں بسر ہوا۔

نوٹ ۔یہاں بہت دیکھا۔کتاب کوئی نہیں۔ایک دو جگہ صحاف ہیں۔اُن کے ہاں صورت دینے ٹوٹی پھوٹی کتابیں رہتی ہیں۔کوئی مطلب کا ورق بھی نہ دکھائی دیا۔شیخ صاحب کے ہاں ایک شخص نے فرمایا۔حدیقہ میگیرید۔ اسے منگا کر دیکھا تو شیخ احمد اردبیلی کا حدیقۃ الشیعہ تھا مگر تقریباً نصف آخیر ہو گا۔

۲۴ اکتوبر ۵۵ء ۱۵ محرم یوم شنبہ۔ کھانا کھاتے ہی سوار ہو گئے۔ ایک فرسخ چل کر ایک بڑی کاروان سرائے آئی۔ جیسے کتل کمارچ پر آئی تھی۔پست مگر مستحکم۔ ½ فرسخ پر چوکی

محصول آئی۔ یہ دریائے پریشان کے پل پر ہے۔ اس میں
مچھلیاں بہت ہوتی ہیں۔ پل کی حد اور اس کا بند کچھ دور تک
جاتا ہے۔ دو فرسخ کے بعد کتل اوشنا (یا کتل دختراں)
شروع ہوا۔ بے ڈھنگی چڑھائی ہے۔ سرتا سر گہری چڑھائی
نہیں مگر پتھریلی زمین ہے۔ اور جو قریباً ہموار ڈھلوان ہے۔
وہ بٹیوں نے خراب کر دی ہے۔ خدا خدا کر کے رات نے
صبح کا منہ دیکھا۔ یہاں کوتل مقام پر منزل ہوئی یہاں ایک
سرائے شکستہ ریختہ ہے اور ایک نئی ہے کہ میر قوم نے
بنوائی ہے۔ اس کا بیٹا اب صاحب کار یعنی حاکم شیراز ہے
اپنے باپ کی سرائے کی چھت کو سلون کے فرش سے پختہ
بنوا رہا ہے بہت عمدہ۔ خوشنما۔ خوش تراش ہے۔ پاس گانو
آباد ہے۔ مجھے انگور کھٹے ملے۔ انار شیریں ملتے ہیں۔ گانو
ایک فرسخ ہو گا ۲۲۔۴ سبز زار قراول۔ محصول کے لئے ہوتے

ہیں ہر ایک سے جنگی کے طور پر کھجور۔ انگور۔ انار وغیرہ کچھ سہی جو کچھ ہاتھ آتا ہے لے لیتے ہیں۔

دو انڈے ہاتھ آئے وہی بہت سے گھی میں پکا کر کھائے

۲۵ر اکتوبر ۱۸۸۵ء ۱۶ محرم یوم یکشنبہ۔ پھر نو بجے سے رات کو اُٹھے۔ کوتل پران کو طے کیا۔ اُتر کر میدان سامنے آیا تھوڑی دُور چل کر دشت ارژن یا ارژنہ ملا۔ یہاں کی ٹھنڈی ہوا اور سردی کا جس قدر شہرہ تھا اس سے زیادہ مجھ پر گذری۔ یابُو سے کود پڑا کہ دوڑ کر گرمی پیدا کروں۔ گھُٹنے بندھ گئے۔ پھر سردی چڑھنے لگی۔ عجیب حالت ہوئی۔ میں گھبرا گیا کہ دیکھے اب کیا ہوتا ہے۔ زور سے چلنا شروع کیا اور ضبطِ نفس۔ جس سے جلد پسینہ آجاتا تھا۔ وہ بھی کیا۔ لیکن دیکھا کہ ایک تدبیر کارگر نہیں۔ گھٹنوں سے پاؤں تک حِس نہیں۔ دم بدم دیکھتا جاتا تھا کہ پاؤں میں خون ہے یا نہیں۔ مرض[1] کو بھی

[1] مولینا کو نل یا انتڑی اُتر جانے کا مرض تھا۔ جو بعض اوقات نہایت زحمت دِہ ہوا کرتا تھا۔

دیکھتا جاتا تھا کہ اُتر تو نہیں آیا۔ الحمدللہ ہر طرح خیریت رہی کوس بھر چل کر حواس درست ہوئے۔ دو کوس پر صبح ہوگئی۔ جب جان میں جان آئی۔ زرنون پر منزل ہوئی

۲۶ اکتوبر ۱۸۸۵ء ۱۷ محرم یوم دوشنبہ۔ سرِشام کھانا کھا کر زنون سے کوچ کیا۔ رات بھر چلے۔ راستہ اُتار چڑھاؤ۔ پتھر اور بٹیوں سے سخت موذی تھا۔ صبح کو شیراز میں پہنچے۔ میں سرائے حاجی عباس میں آکر اُترا۔ مگر نہایت دل تنگ ہوا اور ایسی مکروہات، کا ہجوم ہوا کہ میں بسترِ خاک پر بیٹھ گیا۔ اور بستر کے اوپر تکیہ کر کے رہنکھا ہوگیا۔ سوائے خدا کے کوئی طرف نظر نہ آئی۔ ادھر رجوع کی۔ آخر اپنے تئیں آپ سمبھالا گٹھڑی کھولی۔ کپڑے نکالے۔ گھر سے چُغہ تک نہ لیا تھا خفتان ہی پہنا اور فارک صاحب کے پاس گیا۔ وہاں ٹیلیگراف کے ڈائرکٹر صاحب طہران سے دورہ پر آئے تھے

دو دفعہ جا کر ملاقات ہوئی ۔ بے غرضانہ ملے اور کہا کہ ہمیں آج کل فرصت نہیں ۔ نہ ہم کچھ مدد کرسکتے ہیں ۔ مَیں نے کہا اپنے کتب خانہ کی سیر تو دکھا دیجئے ۔ کہا تمہیں کیا فائدہ ہوگا مَیں نے جواب بیان کیا ۔ فرمایا ۔ دو دن بعد یہ جائیں گے پھر آنا ۔

پھر ایک کتب فروش کی دُکان پر آیا ۔ وہاں ایک شخص مرزا علی خان ملے ۔ وہاں سے آکر نواب حیدر علی خان کے پاس پہنچا ۔ وہاں دُعا قبول نہ ہوئی ۔ اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ جب کام ہوگا تو آنا ہم مدد کریں گے ۔ ان کے دروازہ پر ایک شیرازی مرزا عباس نام کتابیں وظائف نہایت عمدہ خوشخط بیچنے کو لایا تھا ۔ اس سے باتیں ہوئیں وہ دلال ہے ساتھ لیکر ایک شخص کے گھر گیا ۔ اور کتابیں دکھائیں ۔ کُل ۲۳ جلدیں معہ ۲۷ روپیہ کو خریدلیں ۔ حیران تھا کہ کہاں جاؤنگا

اور رات کیونکر بسر ہو گی۔

شہر شیراز۔ می گویند دورِ شہر یک فرسخ است۔ مگر تحقیقت قدرے کمتر باشد شکلِ آبادی تقریباً مدور است۔ زیرا کہ کوہے دائرہ قدرتی پیدا کردہ وشہر مثلِ شہر کابل و مری نگر کشمیر درمیان آں آباد است و ہمیں سال عمرانات قدیم بودہ بخلاف دانایانِ اروپا کہ شہر را بر بالائے کوہ آباد کنند و قباحت صورت اول ظاہر است کہ ہر گاہ در عمرانات محصورہ بسببے از اسباب ہوا کثیف شود و با عام گردد دفع آں دشوار گردد و مدتہا طول کشد۔

آبادی شہر قریب بہ ۶ ہزار خانہ باشد و ایں بہ روایت مردم شمار سیت کہ پنج سال پیش در عہد معتمد الدولہ فرہاد مرزا (بانی ایں شہر) بہ شمار آمدہ۔ شمارہ مردم ما بین ۶۰ و ۷۰ ہزار بودہ مگر رونق کہ الحال دارد از ہمت کریم خان زند است کہ در ۱۱۹۳ھ فوت شدہ۔ اگر نمی بود شیراز از دہے بیش نمی ماند۔

کریم زند چو از دار بہ بیدار گذشت
سہ از نود نود از صد صد از ہزار گذشت
۱۱۹۳

بانی شہر محمد ابن یوسف ثقفی برادر حجاج بودہ۔ ارک حاکم نشین۔ باغ متصل بہ ارک خلوتہائے متعددہ متصل بدین عمارت کہ بہ بازار ارد لیک شہرت دارد۔ وگمرک خانہ وچندین کاروانسرائے وسیع۔ چہار بازار۔ حمام بیرون بزرگ۔ حمام خورد توے ارک۔ مسجد رفیع الشان۔ عمارت حافظیہ۔ سعدی۔ تکیہ ہفت تن۔ تکیہ چہل تن۔ باغ جہاں نما۔ آب انبار بزرگ۔ در شہر قریب بہ مسجد۔ دو چشمہ جاریست کہ شہر شیراز را سیراب می کند۔ اول فنات معروضہ بہ خیرات کہ از قدیم بودہ۔ دوم فناتے کہ مرحوم قوام در ۱۲۹۵ھ بحکومت معتمد ولہ۔ از گوشۂ مغرب وشمال آوردہ وایں فناتے قدیمۃ القدیم ست ویراں افتادہ بود کہ آں را صاف نمودہ وتعمیر کرد۔

در شیراز اگرچه برف می بارد مگر نسبتہ بہ سائر بلاد ایران معتدل است بلکہ بعد از شوشتر بیشتر ایں را گرم شمارند و گویند سوشتر خیلے گرم است و ہنوز عربستان نام برآوردہ - آغا مرزا محمدؐ علی شیرازی بہ مسجد شبیر فقہ و اصول درس می دہد سنش ۵۰ باشد در کربلا و نجف کسب علوم کردہ از تلامذہ شیخ مرتضی بودہ و از حاجی مرزا محمد حسن شیرازی فائض بودہ امروز مرجع خاص و عام شیراز ست -

شیخ محمد حسن محلاتی (شہریست مابین اصفہان و طہران اما از خط راہ افتادہ) فقہ و اصول را درس می دہند مرجع خاص و عام شیراز است عمر از پنجاہ متجاوز قدرے پیش ملا محمد علی محلاتی بہ درس تحصیل کردہ و بعد بہ کربلا و نجف رفتہ اکتساب نمودہ - در مسجد مولے درس می دہد (مولے نام طائفہ ست دریں جا) -

حاجی[۳۳] آغا سید علی اکبر فال اسیری (و این نام دو بلوک از بلوکات متعلقه فارس است که ۱۱ منزل جانب جنوب است) فقه و اصول درس دهد سن قریب به شصت مرجع خاص و عام است تحصیلش در شیراز پیش حاجی شیخ مهدی کجوریست (از توابع مازندران بوده) در خانه خودش در مسجد ولیک درس میدهد که امام آنجاست۔

حاجی[۳۴] آغا سید علی اکبر یزدی شاگرد آخوند ملا حسن ست که مشهور به فاضل اردکانی ست (اردکان از توابع یزد است ۶-۷ ماهست که مرحوم شده۔ آغا سید علی در مدرسه منصوریه درس می دهد و این همان مدرسه است که به عنایت الدین منصور دشتکی یادگار است۔ و دشتک محله از محلات شیراز ست و دشتک دہے ہست در شمال شیراز سه روزه راه و این محله که حالا به سردزک معروف گشته و مدرسه منصوریه ہمیں جاست۔

شیراز- قبر خواجہ حافظ شمال شہر شیراز است از شیراز کہ بر می آئیم و ہمیخواہم برویم بر قبرِ خواجہ درِ م دروازہ پشت سقف والانے بالاخانہ ہست کہ آں را شرقی گویند۔ دالان را تنگ اَللّٰہُ اکبر میگویند و قریب باں چشمہ ہم جاریست و متصل بمشرقی کہ بارہ سنگے در کوہ پایہ است کہ برآں تصویر رستم و دیو منقوش است و ہمیں چشمہ است کہ خواجہ فرمودہ ؎

فرق است زآب خضر کہ ظلمات جائے اوست
تا آب ما کہ منبعِ اَللّٰہُ اکبر است

در زمین و صل است بالاخانہ مذکور۔ دریں بالاخانہ چند قبر ست کہ می گویند درآں قبرہا ہزار ہا تن مردم میروند و زیارت می کنند۔ ہر کہ داخل شہر می شود از زیر ایں قبر میگذرد۔ و ہر کہ بر می آید ہکذا ۔

در شاہ چراغ بیاض ہست بخطِ جناب امیر المومنین علی

ابن ابی طالبؑ۔

سمت مشرق حافظیہ باغیست کہ ہفت تن می نامند زیرا کہ ہفت درویش دراں مدفون ہستند و نزدیک باین چہل تن ست کہ دراں چہل درویش مدفون ہستند و شیخی اطعمہ در آنجا مدفون است۔

جانب جنوب چہل تن و ہفت تن کہ زراعت می کنند ہمیں جاست کہ در عہد خواجہ درانجا جعفر آباد آباد بود و باغہائے سرسبز چنانکہ فرماید ؎

میانِ جعفر آباد و مُصلّٰی
عبیر آمیز می آید شمالش

مُصلّٰی۔ ہرگاہ از شہر برویم۔ حافظیہ۔ و ما بہ شمال می آئیم۔ دستِ راست حافظیہ است۔ دست چپ قدرے مسافت طے کردہ۔ جائے بود کہ آں را مُصلّٰی می گفتند۔ حالا ہیچ نسبت

اثرے ازاں باقی بود کہ شاہزادہ فرہاد مرزا درانجا عمارتے
تعمیر کردہ نام مُردہ را زندگی دادہ اند ہرگاہ از شہر بجانب شمال
بُروند قریب یک فرسنگ طے کردہ چشمۂ رکنا دبر می آید
آں را رکنا باد گویند کہ رکن الدولہ دیلمی ازاں قنات کردہ
بہ شیراز آوردہ بودے

اگرچہ زندرود آب حیات ست
ولے شیراز ما از صفہاں بہ

زندریائے اصفہان است سہ جا پُل طولانی از عہد شاہ عباس
تعمیر است۔

۱۔ از جانب تخت فولاد۔
۲۔ جانب جلیف۔

مینار ضیان در اصفہان از عجائب روزگار است
دو فرسخ از شہر تا لارے ہست۔ ہر دو گوشۂ آں دو مینار ہستند۔

زورخانہ - مکان زورخانہ است پہلو - در ہر پہلو یک طاق کہ در آنجا لباس بیروں آرند و وسط زمین گود آں را گود زورخانہ گویند - و آں را بقدر سہ چہار بالائے انسان میکنند اول بقدر یک بالا خار ریزند - بالائے آں زبل (تپئین - سرگین) و بالائے آں گل نرم بختہ میریزند تا جسم پہلواں آسیب نرسد -

اول پہلوان تنگہ می پوشد و آں زیر جامہ تنگ تا بہ زانو باشد پنبہ دار - کاسہ زانوش را چرم کنند و کمرش سیر قلاب زنند (مگر ایں جا باب نیست) -

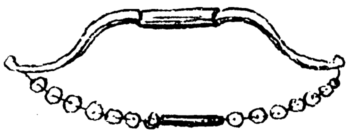
اسباب زورخانہ

تنبک - شخصے کہ صاحب زورخانہ است او را سر دمدار و کہنہ سوار گویند - در زورخانہ بالائے سکو (دکان) نشستہ بہ توائبکہ او میزند دیگراں زور میگیرند -

میل - ہر نفر بہر دو دست دو میل گرد تیر میکنند و بال او میدہد -

گاہے بر روے دوکتف می گذارد۔ بہ ترتیب چپ و راست مشت را زیر و بالا کند۔ گاہے یک میل را بدست گیرد و دست را ستون کردہ بہ پیش خود بہ دور جولاں دہد۔ گاہے بزوریکہ دارد بہ ہوا انداز د میل می رود تا قبہ و چوں بزیر آید بسرعتے در ربا ید نوعے کہ در دست گرفتہ بود۔

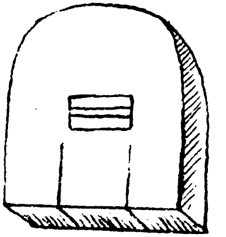
گبر۔ گہ ایں کہ ہر دو میل را دور سر می گردانند۔ (عمل گبر)



کبّادہ (لیزم)

ایک گھنگرو دار کمان۔ جس کے کھینچنے سے ورزش ہوتی ہے

سنگ، آں دو تختہ مستطیل بالاش ہلالی وزن ۳ یا ۴ من تبریزی۔



پہلوان بر زمین بہ قفٔ خواہد سر بالا در دست یکے را
بردارد و پہلوے چپ غلطد۔ باز بہ دست چپ۔ پنجہ بر مقام الف
بردارد و بہ پہلوئے راست غلطد و ایں ورزش زور تمام خواہد
کارہائے کہ در زورخانہ کنند شنو ہر چہ معارف اہلِ ہند است

پا بہ دیوار زدن۔

تختۂ شلنگ۔ فقط جہیدن است از پائے بہ پائے۔

گاہ باہم کُشتی می گیرند۔ بخاک بُردن پُشت پہلوان را
بزمیں رسانیدن است۔

بعد از فراغ کار زورخانچی توسے کلک دمنقل گلی ہغوری
بسیار چیدہ آب گرم درانہاست بہ زور و زران خستہ مہند
کہ میخو رندا ینکہ کسانیکہ کشتی می گیرند۔ از حق چراغ می طلبند
یعنی پول می طلبند۔ ہر کس چراغ اول بدہد خداوند چنین و
چناں کند۔ و ہر کس چراغ دوم را بدہد چنین و چناں شود

وایں ہمہ حق زورخانچی است بہ علاوہ ایں ہر کس کہ ہفتہ بقدر خود مثلاً شاہی دو شاہی تا عباسی دو عباسی بہ او دہد۔

حمّام

تقریباً دو سو حمّام ہوں گے۔ بہر حمام معین ست کہ در ہفتہ دو روز زنہا میروند و باقی برائے مردان است مرداں را مرداں خدمت و مشتمال میکنند و زناں را زناں۔

مرد باشد اول مرتبہ ۴ و ۵ شاہی اوسط
- نیم قران
- دہ شاہی۔ یک قران
- پانصد دینار
- بهن آباد

پیش از صبح صادق حمّام کشادہ می شود تمام روز تا شام جاریست۔ استاد نشستہ است کہ پول می گیرد۔ دلاک سر می تراشد۔ جامہ دار فدیفہ می آرد و قلیان می دہد۔ آب گیر

آب می ریزند مردم را روئے سر۔ شاگرد دلاک و دلاک مشتمال کنند اگر ورود صبح زود باشد فنجان آب گرم آورده می دہند کہ از بیروں آمده اند۔ بخورند و گرم شوند ایں کار اکثر جامہ دار باشد۔

اول می روند در جامہ کن می نشینند ایں را بینہ (بوزن کینہ) ہم گویند۔ یک قلیانے می کشند کہ بینہ دار می آرد و ایں ہماں جامہ دار است۔ بعد از ساعتے دروں می روند گاہست اینجا آب گرم می دہند گاه دروں۔ عمارت جامہ کن ہشت درہ باشد ہشت پہلو۔

دروں حمام گاہے حنا بندند و خضاب کنند و نوردہا کشند البتہ دو ساعت دیر میکشد و الا نسبت بہ نسبت وقت کمتر صرف می شود۔ گاہے اوساط و غربا از بازار کباب دانہ و نان و خربزه انار شکنجبین برف آب انداختہ میخورند۔

زنہا اکثر تربزہا میخورند۔ لب طاس می کشند می خورند

که خود به حمام می برند- مردها نمی برند- زنها کیسه و سنگ پا هم با خود
می برند- در نوره خانه آهک و زرنیخ و تخم مرغ کوبن را مثالِ چینی
فغفور می کنند و این ها برائے ترقی مقام باشد اگر زنها بکار برند
و در حمام دو روز که مخصوص زنها است پیش از صبح تا ساعت
دو ساعت روز برآمده مردمان غسل کنند- بعد بنیه دار یا استاد
پشت سقف حمام میروند و سفید مهرها (گوش ماهی) می برند- تا اینکه
زناں خبردار شوند و بیایند- اوباش و الواط محاوره گشته که اگر
بکس وعده کنند که دو ساعت روز برآمده بفلاں جائے بردیم
پیش شما بیائیم- هنگام بوقِ حمام می آئیم-

توون حمام بوزن نون جائیکه آتش افروزند یعنی گلخن-

۳۱ اکتوبر ۸۵ء ۲۲ محرم ۱۳۰۳ھ یوم شنبه- خواجه حافظ
کی قبر کی زیارت کی- قبر کا حال علیحده لکھا جاتا ہے یہاں کی
قبروں پر صاحبِ قبر کی تصویر بھی برائے نام کھینچتے ہیں اور

یہ صورتہائے خاص میں ہوتا ہے۔

مزار میں گھنٹہ بھی بجتا ہے شاہ چراغ کی قبر پر ظل السلطان مسعود مرزا نے اصفہان سے ایک گھنٹہ بھیجا ہوا ہے۔ وہ بجتا ہے۔ تمام شہر میں آواز پہنچتی ہے۔ طلوع آفتاب پر ایک بج کر شام تک ۱۲۔ شام سے پھر ایک ہو کر صبح تک ۱۲ بجتے ہیں۔ اور کہتے ہیں حالا سہ ساعت روز آمدہ اور حالا دو ساعت روز باقی ست۔

جلال الدولہ سلطان حسین مرزا۔ ظل السلطان کا بیٹا ۱۶ برس کی عمر ہو گی حاکم شیراز ہے۔ حکومت صاحب دیوان مرزا فتح علی خان برادر قوام الملک کرتا ہے۔ قوام الملک وہی ہے جس کے مقبرہ نے خواجہ حافظ کی قبر کی سمت قبلہ اعلیٰ درجہ کی رونق دی ہے۔

قبر مرزا عباس مدرس کتب حکمت کہ یک ماہ پیش فوت شدہ

برابر قبر خواجہ حافظ واقع است در ایران بود کہ برروع درویش گدا مردم طلبا باغوائے علماء برائے قتلش نوشتند کہ خونش مباح و معتمد الدولہ کہ آں بیچارہ را از دستِ شاں نجات بخشید و علماء را تنبیہ کرد۔

مرزا عباس اشعار عربیہ و تصانیف ملا صدرا و شرح منظومہ و غیرہ کتب حکمت را درس می گفت ۔ ۲۰ ـ ۳۰ طلبا در درسِ او حاضر بودند۔ شرح بر قصیدہ ہائے میرزا فندرسکی نوشتہ کہ در فارسی قصیدہ ہائے فصیح بودند و دعائے رجبیہ ہم شرح نوشت (ازیں کہ دعائے مذکور در ماہ رجب خوانند)۔

تمام سنگ یشم کا ایک تعویذ ہے۔ گرد ایک لوہے کا جنگلا ہے۔ گرد بیسیوں قبریں ہیں۔

قبر پر حوض مستطیل بزرگ و عمارتے کہ چہار ستون سنگ دارد بدرازی متوازی قبرِ خواجہ میرود و میان وسعت صحن۔

جانبِ مشرق قبر دائی۔ و قبر عروس معتمد الدولہ فرہاد مرزا مقام مذکور را بہ سبب قبر خواجہ حافظ حافظیہ گویند و ہر شب جمعہ قریب بہ عصر تا شام اکثر اہلِ شیراز برائے فاتحہ روند۔

لوح

چراغِ اہلِ معنی خواجہ حافظ　　بخواں تاریخش از خاکِ مصلّٰی

بر سرِ تربت چو گذری ہمت خواہ　　کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

مژدۂ وصلِ تو کو کز سرِ جاں برخیزم　　طائرِ قدسم و از دامِ جہاں برخیزم
بوفائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی　　از سرِ خواجگیٔ کون و مکاں برخیزم
یارب از ابرِ ہدایت برساں بارانے　　پیشتر زانکہ چو گردے زمیاں برخیزم
بر سرِ تربتِ ما بے مے و مطرب منشیں　　تا بہ شوقت زلحد رقص کناں برخیزم
گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم دہ　　تا سحر گہ زکنارِ تو جواں برخیزم

خیز و بالا بنما اے بُتِ شیریں حرکات
کہ چو حافظ ز سرِ جان و جہاں برخیزم

اے دل غلامِ شاہِ جہاں باش و شاہ باش
پیوستہ در حمایتِ لطفِ الٰہ باش

از خارجی ہزار بیک جو نمی خرم
گو کوہ تا بہ کوہ منافق سیاہ باش

آں را کہ دوستیِ علیؑ نیست کافر است
گو زاہدِ زمانہ و گو شیخِ راہ باش

امروز زندہ ام بولائے تو یا علیؑ
فردا بروحِ پاکِ اماماں گواہ باش

قبرِ امامِ ہشتم سلطانِ دیں رضا
از جاں ببوس و بر درِ آں بارگاہ باش

حافظ طریقِ بندگیِ شاہ پیشہ کُن
وانگاہ در طریق چو مردانِ راہ باش

۷ نومبر ۱۸۸۵ء ۲۹ محرم ۱۳۰۳ھ روز شنبہ شیخ سعدی رح کی قبر پر گیا۔ بڑے بڑے عالیشان در کا ایک ایوان ہے۔ داہنے ہاتھ کے تین در کھلے ہیں۔ بائیں طرف کے دو در بند ہیں۔ آخر

کے در میں شیخ کی قبر ہے۔ سنگ باسی کا تعویذ ہے۔ گز بھر بلند صفحہ قبر پر اشعار نعتیہ بوستان کے انتخاب کر کے بصورت ذیل کندہ کیے ہیں۔ یہ عمارت عالیشان ہے اور سامنے در اور اندر حجرے ہیں۔ عین مقابل ہیں دروازہ رکھا ہے دائیں بائیں بلند دیواریں ہیں۔

صدر عمارت کے آگے تین چار گز کا اونچا چبوترہ رکھا ہے۔ اس میں ایک مستطیل حوض بھی ہے مگر مختصر۔ صحن میں سرو وغیرہ کے درخت ہیں۔ دائیں پہلو عمارت ہیں گاؤں آباد ہے۔ بائیں پہلو پر ایک بقال کی دکان ہے۔ وہ دیہہ مذکور کا دہی بہت مشہور ہے۔ لڑکے عورتیں اور تمام لوگ سیر کو جاتے ہیں تو دہی اکثر کھاتے ہیں۔ قبر شیخ پر پہلے ایک تعویذ تھا کہ عہد اتابک میں لگایا گیا۔ وہ عمارت گردش زمانہ سے فرسودہ اور تعویذ جدا ہو گیا۔ چند بار امام نے توڑ بھی ڈالا۔ اس کا ایک

ٹکڑا وہاں پڑا ہے۔ وہ ایک چار طاق تھا۔ عمارت موجودہ
کریم خان زند نے تعمیر کی۔ غالباً ۔۔۔ کے پس و پیش میں
بنی ہو گی۔ شیخ حسین ناظمِ شریعت نے ۲۰۔ ۲۵ برس ہوئے
کئی من کا سنگِ تعویذ تڑوا ڈالا۔ مرزا علی اکبر قوام
صاحبِ دیوان کے باپ نے پھر پتھر موجودہ کو لگوایا۔

چبوترے پر متفرق اشخاص کی قبریں ہیں۔ ہر ایک پر
تین تین چار چار سطریں بھی کندہ ہیں۔ کہاں تک پڑھتا۔ کہ
مجھے بہت کام تھے۔ اور آج سب سے زیادہ کام یہ تھا کہ
کپڑے دھلوانے تھے۔ ایک تاریخ قابلِ تحریر ہے۔ کہ مُلّا
علی حکیم کی قبر پر ہے انھوں نے اپنی صلاحیتِ نفس کے سبب
سے خاص و عام میں قطب کا لقب حاصل کیا تھا۔ جب مر گئے
تو مرزا علی۔ انصاری تخلصی نے تاریخ کہی۔ ع

از دائرہ قطب رفت بیروں

یہ ان کی قبر پر کندہ ہے۔

لوحِ مزارِ شیخ سعدی رحمۃ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَنْتَ الْبَاقِی وَکُلُّ شَیْءٍ ھَالِک

کریم السجایا جمیل الشیم — نبی البرایا شفیع الامم
شفیع الوریٰ خواجہ بعث و نشر — امام الہدیٰ صدر دیوان حشر
امامِ رسل پیشوائے سبیل — امینِ خدا مہبطِ جبرئیل
شفیعِ مطاعِ نبیٔ کریم — قسیم جسیم نسیم وسیم
نماند بعصیاں کسے در گرو — کہ دارد چنیں سیدِ پیشرو
چہ نعتِ پسندیدہ گویم ترا — علیک الصلوٰۃ ای نبی الوریٰ
درودِ ملک بر روانِ تو باد — بر آلِ تو و پیروانِ تو باد
خصوصاً شہنشاہِ اہلِ سوا — علیؑ ولی صاحبِ ذوالفقار
خدایا بحقِ بنی فاطمہ — کہ بر قولِ ایماں کنی خاتمہ

اگر طعنم زد کنی ورقبول — من و دست و دامانِ آلِ رسول

خدایت ثنا گفت و تبجیل کرد — زمین بوس قدرِ تو جبریل کرد

ترا عزِ لولاک تمکین بس است — ثنایِ تو طٰہٰ و یٰسین بس است

بود اہلِ عالم ز وصفِ تو لال — قران ارقیاس است جاہ و جلال

چہ وصفت کند سعدیِ ناتمام

علیک الصلوٰۃ و علیہ السلام

مرزا علی اکبر شیرازی اول قوام شیراز بود و قوام خطاب امارت است از طرف بادشاہ و بس قوام مذکور دو پسر داشت مرزا علی محمد خان کہ ذکرش در ذیل قبر خواجہ حافظ۔ دوم مرزا فتح علی خان کہ حالا صاحب دیوان شیراز است بہ نیابت جلال الدولہ حکومتِ شیراز می کند صاحب دیوان مقبرہ برادر برابر حافظیہ تعمیر کردہ و باغِ دلکشا در راہِ سعدیہ تعمیر کردہ کہ ہنوز ناتمام است بوقلمون ہائے بسیار در انجا گذاشتہ

اکثر مردان وزنان تنہا سال بسال روند۔

فیروز آباد از توابع شیراز است۔ تقریباً دو منزلے شیراز جانب مغرب واقع است در عہد قدیم خیلے آباداں بودہ و بیشتر آبادیش بربالائے کوہ بودہ چنانچہ آثار عمرانات آں از منازل منہدمہ و باد آسیا ہائے برباد ہنوز باقی ست۔ محمد ابن یعقوب مجد الدین فیروز آبادی از آں جا بودہ۔

فسار از مضافات شیراز ست دو منزلے شیراز بر جانب جنوب واقع است قصبہ بزرگیست و سید علی خاں بلاغت صاحب شرح صمدیہ و صحیفہ سجادیہ از انجاست۔

بیضار۔ از متعلقات شیراز بودہ سہ منزل جانب شمال ناصر ابن ابن عبد اللہ بیضاوی صاحب تفسیر بیضاوی از انجاست۔

سفرِ من از شیراز تا اصفہان و طہران

شہر شیراز میں پندرہ دن توقّف کیا۔ ۲ صفر ۱۳۰۳ھ سہ شنبہ ۱۰ نومبر ۱۸۸۵ء کو روانہ ہوا۔ اگرچہ اس عرصہ میں روانگی کے لئے مضطر رہا اور شدّتِ سرما کا خوف ہر وقت سامنے تھا مگر اس لحاظ سے کہ شیراز جیسے شہر میں ٹھیرنا ہوا۔ یہ توقّف بیکار بھی نہیں ہوسکتا۔ اور توقّف حقیقت میں وہ بھی ایک دو دن آخر کے ہیں۔ جو کہ نواب مرزا علی خان صدر کے ہاں گذرے کیونکہ معلومات کا سامان یہاں کمال وفور کے ساتھ ملا نواب جس طرح مال و دولت اور جاہ و منصب سے امیر ایسے ہی علم و فضل اور کتب خانہ کے اعتبار سے بھی امیر ہیں۔ افسوس اُن ۱۲ دن کا جو مرزا علی اکبر کے گھر گذرے۔ اس بیچارے غریب زادہ کو جس نقطہ پر دیکھو اپنی غربت اور افلاس سے واجب الرحم ہے

میں نے اپنے علم و آگاہی سے جو کچھ دیا اپنے حوصلے سے بہت زیادہ تھا اور اُس پر ایک وقت بھی مہمانی کا بوجھ نہ ڈالا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں دونوں وقت ماحضر حاضر کر دیا کروں گا آپ مجھے مصارف دیدیا کریں۔ مَیں نے تین دن کے امتحان کے بعد اس سے بھی پیچھا چھڑایا۔ کیونکہ تیسرے دن اُس کے بُڈھے باپ نے دیکھا کہ مہمان نے جو بقیہ زادِ سفر کا تھا۔ گھی وغیرہ گھر میں بھیج دیا اور دونوں وقت گوشت پکواتا ہے تو وہ بھی آن موجود ہوا۔ بلکہ نواسوں کو بھی بُلا بُلا کر بٹھانے لگا۔ میں گھبرا کر الگ ہوگیا۔ یہ بُڈھا لوہار ہے بندوقیں بناتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ کیا لکھنا شروع کیا تھا۔ کیا لکھنے لگا۔

اس سفر میں کہ خدا مبارک کرے۔ ۵ تومان کرایہ شیراز سے ملتان تک ٹھیرا ہے حسین علی خان خلف الصدق نور محمد خان رئیس گدّم کے ساتھ ہم کجاوہ ہُوں۔

۱۲ ارصفر جمعہ۔ آبادہ۔ حاجی ملا عبداللہ سے ملاقات ہوئی تلگراف خانہ ہے۔ آغا نور سے ملاقات ہوئی آج کا مقام دلچسپ تھا۔

۱۳ ارصفر شنبہ سلجستان۔ گانو خراب ہے ہر بات کی تکلیف۔ یہاں حاکم خیلبان سے ملا۔ وزیر نوکر (کہنہ)

۱۴ ار یکشنبہ تعمیر مسجد فی سنۃ خمسمائۃ من تاریخ الہجرۃ المصطفویۃ وبناء ابواب الخشبیۃ لہا من حیث الوقف فی سنۃ خمس و خمسین وستمائۃ الہجریۃ مع حاجرۂا الف الف صلوٰۃ وتحیۃ والواقف لابوابہا امیر الاعظم شمس الدین واقف باب المسجد امیر الاعظم علاء الدین فی سنۃ اربعین وثمانمائۃ۔

۱۵ ارصفر دوشنبہ۔ امن آباد میں ۳ فرسخ پر برلبِ نہر ٹھیرے۔ یہاں ایک سرائے شاہ عباس اور حمام ہے مگر مرمت طلب معصومہ میں منزل ہوئی۔ ویران مفلس کنگالا ہے۔

مرآباد۔ مرآباد میں منزل ہوئی۔ سرائے ویران گانو دُور اور ویران ہر بات کی تکلیف ہے۔

۲۲ صفر دوشنبہ اصفہان سے طہران کے دو رستہ ہیں۔ چلنے لگے تو مشورت ہوئی کہ دن کا رستہ بہت ٹھنڈا ہے۔ میمہ اور مورچہ خاک کے رستہ میں اگرچہ دو دن کا پھیر ہے مگر ذرا گرم ہے۔ اِس لئے اِس رستہ روانہ ہوئے۔ ۳ فرسخ چل کر مقام گز میں منزل ہوئی۔ ایک کچی سرائے میں اُترے۔ اگرچہ شاہ عباس کی عالیشان سرائے سامنے ہے مگر اِس غرض سے کہ یہ شہر سے ملی ہوئی ہے۔ اسلئے اسی میں اُترے۔ شہر میں باسی روٹی شاہی کو ایک ٹکڑا پنیر کا شاہی کو سوا چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک کھجوریں۔ شاہی کے ۱۴ اخروٹ ملتے ہیں۔ میں نے کھجور روٹی پر گذارہ کیا۔

شام کو میں نکلا کہ کچھ کھانے کو ہو تو لاؤں۔ ایک مجلس

کی آواز کان میں آتی جا کر شامل ہوا اور فیض عظیم پایا۔ دو چھوٹی چھوٹی پیالیاں چائے کی پی کر رخصت ہوا۔

یہاں قہرمان خان کہ لشکر ظل السلطان میں منصب سلطان رکھتے ہیں معہ عیال آکر شامل ہوئے نہایت با اخلاق اور بزرگانہ مزاج رکھتے ہیں۔

۲۴ صفر سہ شنبہ۔ موزچہ خاک میں منزل ہوئی عجیب ویران اور بے برکت گانو ہے۔ ایک حاجی اور میں گانوں میں گئے کہ کچھ کھانے کو لائیں جس سے پوچھتے ہیں۔ کہ روٹی ہے وہی نہیں۔ فکر نان ہیں حاجی کو بھی شوق دامنگیر ہوا کہ ایک گھر خالی نہ چھوڑوں۔ آگے وہ پیچھے میں وہ کہے صاحب خانہ روٹی ہے گھر میں سے لڑکا لڑکی کوئی عورت کہے نہیں۔ میں کہوں الحمد للہ۔ حاجی کہے مرغ ہست۔ میں کہوں خدا نکند۔ حاجی پوچھیں تخم مرغ ہست۔ میں کہوں انشاء اللہ

نباشد۔ حاجی کے پاس پہلی منزل کی روٹی تھی۔ وہ واپس آیا۔ آخر ایک جگہ چند شخص بیٹھے تھے۔ ایک شخص کو مرد آدمی سمجھ کر میں نے کہا۔ کہ آغا ایں پول حاضر است مگر شما بدانید بقیمت میدہید۔ للہ بدہید۔ اُس نے سفارش کی۔ جب اس شخص نے سوائی قیمت لیکر چار خشک روٹیاں دیں۔ وہ لیکر خدا کا شکر کرتا واپس آیا۔ یہاں بھی کارواں سرائے عالی شاہ عباس کی ہے۔ چاروں طرف کا میدان خالی از لُطف نہ تھا۔

۲۴ صفر چہار شنبہ۔ کارواں سرائے شاہ عباس۔ روٹیاں وافر۔ گوشت پکا ہوا موجود۔ لوگوں کے عمدہ اخلاق ایک آبادی بلندی پر۔ ایک سطح زمین پر۔ میں آخوند مرزا جعفر سے ملا۔ ۲۔ نارنج تحفہ دیئے۔ انگور بہت تھے مگر تُرش تھے۔

۲۵ صفر پنجشنبہ۔ تہرود۔ آغا ابراہیم خجندی سے

ملاقات ہوئی۔ یہاں عجیب روضہ خوانی دیکھی۔ اور آج معلوم ہوا کہ شبیہ کشیدن سے کیا مطلب ہوتا ہے۔ بڑی لمبی اور پھیلی ہوئی آبادی اور برخلاف تمام ملک کے بلندی پر آباد ہے۔ درہ میں اور بلندیوں پر۔ اقسام میوہ جات کے باغ پٹے ہوئے ہیں۔ کھجوریں بھی ہیں۔

۲۶ صفر جمعہ۔ کاشان میں شام کو پہنچے۔ سرائے دم دروازہ میں اُترے فصیل کے اندر اور گرد شہر بھی ویران پڑا ہے۔ بازار شہر کے پٹے ہوئے ہیں خوب آباد ہے۔ یہاں کی مسگری خوبی میں مشہور ہے۔ دروازہ فین کے باہر واقع ہے فین نہر کا نام ہے کہ شہر کے نیچے بہتی ہے۔ مُلّا محسن فیض کا مقبرہ آخوند فیض کے نام سے مشہور ہے۔ ملا فتح اللہ صاحب تفسیر منہاج الصادقین کی قبر ہے۔ بابا شجاع الدین کی قبر ہے۔

۲۷ صفر ہفتہ۔ آج مقام تھا۔ امام رضا اور جناب امام

حسن علیہ السلام کی شہادت تھی۔ دکانیں اکثر بند تھیں۔ ایک جگہ بازار میں علم اور حلقہ ماتم دیکھا۔ ایک جگہ قصہ خوان نے ایک پردہ پر تصویر صورتِ حال نقش کر کے گذرگاہِ عام میں دیوار پر آویزاں کی تھی اور فصاحت کی داد دے رہا تھا

رات کو کوچ ہوا۔

۲۸ صفر اتوار۔ سن سن جنگل میں اُترے۔ سرائے شاہ عباس کیا اثر کر سکتی تھی۔ رُوکھی روٹی چبائی اور جوئیں چُنیں۔

۲۹ صفر پیر۔ پاسنگون (پائے سنگان) حاجی آغا جعفر کی سرائے میں اُترے جنگل میدان میں اُترے۔ آب انبار میں پانی بھرا تھا۔ ایک قہوہ خانہ بھی تھا۔ دو تین قہوچی شیطان گانے بجانے میں اُستاد تھے اور بدمعاشی میں چالاک ٭

رات کو عمدہ اور سفید پوش اشخاص کہ اکثر مع عیال تھے طہران سے آکر اُترے۔ ان میں ایک نوجوان لڑکا ملا۔ کہ

باسامان تھا اور معلوم ہوا کہ آٹھویں پشت میں ملا باقر مجلسی کا
پوتا ہے۔ مرزا محمد عرف مرزا کوچک نام ہے۔ ان میں مرزا
ترک ملازم ظل السلطان کے ہیں کہ نے نوازی اور موسیقی میں
مہارت کامل رکھتے ہیں۔ اُن کے اخلاق خاکساری اور
مُسافر نوازی کا آزاد شکرگزار ہے۔

یکم ربیع الاول سہ شنبہ کو پہلے حضرت کے آستانہ پر
معصومہ قم میں حاضر ہوئے۔ شیخ علی ابن بابویہ کے مزار پر
جا کر فاتحہ پڑھی۔

۲ ربیع الاول چارشنبہ کو منزل ہے قنات ڈھونڈتا ہوں
بنیاد حسین ولد تصدق حسین سید زیدی ترمزی مع اپنے باپ
کے مشہد مقدس سے آئے ہوئے ہیں۔ کربلائے معلّیٰ جائینگے
سید حسین ایک شخص کہتے ہیں کہ میں آگرہ کا ہوں۔

از طہران تا مشہد

۲۲ رجمادی الاول۔ از طہران شاہ عبد العظیم یک فرسخ برادر حقیقی امام غریب انجام رضا علیہ السلام ہستند۔ گنبد امام زادہ طاہر در برابر شاں و امام زادہ حمزہ در پہلوئے شاں امام زادہ حمزہ پسر امام زین العابدین علیہ السلام شیخ ابن بابویہ قمی علیہ الرحمۃ از شاہ عبد العظیم تا خاتون آباد ۵ فرسخ بر کنار چشمۂ علے مدفون اند۔ عمارت نو تعمیر است کہ شاہ تجدید آں کردہ در اصل قبر طغرل نگیں بودہ از کتابے کہ در کتب خانہ مشہد بود بہ تحقیق رسید۔

۲۲ رجمادی الاول ۱۳۰۴ھ یکشنبہ۔ از طہران برآمدہ بشاہ عبد العظیم رحمۃ اللہ مقام کردم۔ برادر حقیقی امام رضا علیہ السلام ہستند۔ امام زادہ طاہر رحمۃ وہم شاہزادہ حمزہ در

پہلوِ شاں ہستند۔ شاہزادہ حمزہ پسر امام زین العابدین ہستند بعدہٗ برائے فاتحہ بر قبر شیخ ابن بابویہ قمی علیہ الرحمۃ رفتم۔ بر کنار چشمہ علی قبر مقدس واقع شدہ۔ جانب جنوب مینا دار عمارت ست کہ اول قبر پادشاہ گمنام مشہور بود۔ چوں شاہ بزیارت مشہدِ مقدس رفت در کتابخانہ حضرت کتابے یافت ازاں معلوم شد قبر طغرل نگین است عمارتیکہ شکستہ ریختہ بود آں را تجدید فرمود۔

۲۳ جمادی الاول۔ از خاتون آباد تا ایوان کیف۔ ۷ فرسخ بد جائیست سرائے خراب بد عمارت برائے خورش ہم ہیچ نیافتم۔

۲۴ جمادی الاول۔ ایوان کیف قشلاق } ۵ فرسخ در راہ

۲۵ جمادی الاول۔ قشلاق دہ نمک } اردون دہے

یافتم دراں عمارتے بلند سہ منزلہ بہ خوف ترکماناں ساختہ بود۔

۲۶ جمادی الاول دہ نمک لاسگرد۔ ۷ فرسخ دریں جا ہم

عمارت مذکور دریں جا مراد علی نام ہمسایہ را دیدم از قید غلامی خلاص شدہ ۲۶ سال بہ بخارا بودہ۔

۲۷ر جمادی الاول۔ لاسگرد۔ سمنان ۴ فرسخ۔

۲۸ر جمادی الاول۔ یک روز قشلاق کردیم۔

۲۹ر جمادی الاول۔ سمنان۔ اہوان۔ ۶ فرسخ دراہوان آب خیلے کم یاب۔ کنار آب خیلے زحمت کشیدم چوں سہ فرسخ درمنزل باقی ماندہ دیدم برف موجود است و آں زیاد شدہ ہر وقت تا کہ رسیدیم بمنزل اہوان تمامتر راہ سفید سرائے شاہ عباسی را حاجی علی نقی مرمت کردہ بود ۱۲۸۵ھ۔

۳۰ر جمادی الاول۔ اہوان۔ خوشہ ۶ فرسخ منزل بالکل ویران تمام راہ آب می بود برف برطرف شد مگر خشک بدستور آغا محمد یوسف (بہ دکتور محمد یوسف) ملاقات شد کہ برسالہ غلامان خاصہ واکتر ہستند۔

۱۔ قوشہ۔ دامغان ۶ فرسخ ایں منزل ہم بالکل ویران و امغان
تمام راہ سراب در بیرون شہر کاروان سرائے شاہ سلیمان
صفوی۔

۲۔ دامغان تا دہ ملا ۷ فرسخ راہ خوب۔

۳۔ دہ ملا تا شاہ رود دہ فرسخ راہ خوب۔

۴۔ شاہ رود تا میاجے ۱۰ فرسخ۔

میاجے تا مہاں دشت ۶ فرسخ۔

مہاں دشت تا عباس آباد ۶ فرسخ۔

طہران تا قزوین۔

طہران تا کرج ۶ فرسخ۔

کرج تا گازرسنگ ۶ فرسخ۔

گازرسنگ تا عبداللہ آباد ۶ فرسخ۔

عبداللہ آباد تا قزوین ۴ فرسخ۔

طہران تا رباط کریم ۶ فرسخ۔

رباط کریم تا خان آباد ۹ فرسخ۔

خان آباد تا کوشکک ۶ فرسخ۔

کوشکک تا آزادہ ۶ فرسخ۔

آزادہ تا نیاوراں ۶ فرسخ۔

نیاوراں تا تاوراں ۶ فرسخ۔

تاوراں تا عبداللہ آباد ۶ فرسخ۔

عبداللہ آباد تا ہمدان ۶ فرسخ۔

۱۶ ر جمادی الثانی یوم سہ شنبہ۔ سبزوار۔ آغا مرزا عبدالغفور داماد محمد ہم را در تلگراف خانہ دیدم۔ با خلاق کریمانہ پیش آمد۔ قائمقام آغا محمد اسمٰعیل خان سرہنگ کار تلگراف خانہ را سرانجام می دہند۔

مسجد جامع بزرگ بنا ئیست مگر کسے نمیداند کے تعمیر شدہ

از علماء و طلباء معمر سوال کردم خنده کردند و گفتند۔ این بما تعلق ندارد۔ شخصے گفت کہ دخترے برائے نواب بانیٔ این گشته بود۔ البته ۴ صد سال شده باشد۔ شخصے گفت کہ ایوان پیشبند یعنی دروازه دوم دروازه اول بست عمارتے داشت ۵۰ سال ست کہ تعمیر شده۔ مابچه بودیم و میدیدیم گویند آغائے شریعت مدار تعمیر کرده۔

مدرسه دارد کہ گویند در عهد نادر تعمیر شده تاریخے به پیشانی دروازه منقوش۔

و این لفظ آخر ہیچ معنی ندارد۔ پرسیدم کس جواب نداد

این مدرسه بمدرسه حاجی ملاهادی شیرازی شهرت دارد ۶ سال ست کہ مرحوم شدند۔ بیرون شهر مقبره شان است (خدا رحمت کند) علم الٰهیات را به قرآن و حدیث ربطے داده بودند کہ خود صاحب طرز توان گفت صاحبدل و اهل الله و

مقدس مرمت بود۔

مدرسہ دیگر جناب شریعت مدار حاجی مرزا ابراہیم تعمیر فرمودہ کہ ہنوز عمارتش جاری است جز دو گرد مینارش مائل بہ انہدام بود۔ شاہ خلد اللہ ملکہٗ در سفر مشہد مقدس سکونے دو منار را تعمیر کردہ حالش ازانجا تواں دانست۔

در سبزوار تریاک بسیار میکارند دور گون آباد نوبت بجائے رسیدہ کہ گندم از خاف می آرند منزل ست زعفران تا غی از صحراہائے سبزوار خیزد بہ مشہد ہم ازیں جا میبرند۔

شہر بہمن دو فرسخ پیش از سبزوار در راہ طہران آباد بود کہ کلوخ آں ہم نماندہ ہم بخاک برابر شدہ۔

گون آباد از سبزوار جانب دست راست قصبہ ہست ۱۲ فرسخ۔

در راہ بمنزل دہنان آبے می آید کہ پل ابریشم برائے

آں بستہ اند مگر درصحرا آخوند ملا سلطان علی مردے صاحبِ کشف واہل اللہ درآنجا موجود است۔

از میاجے اکبر واماں کوہ۔ کتل مِنْدَرُسْن برغون کلاہ استرآباد مدرسہ منصبیہ کہ حاجی ملا ہادی درس می داد۔ مدرسہ فخریہ صنائع آں را ساختہ بود۔ غالباً از بندہائے شاہ عباس بود بسطام از شاہ رود یک فرسخ دست راست۔

در معصومہ قم فتح علی شاہ محمد شاہ شاہ عباس بادشاہ ناصرالدین شاہ۔ عباس مرزا در مشہد نبیرالدولہ حاکم سبزوار پسر فتح علی شاہ ۷۰ سالہ باشد۔ نادرقلی مرزا بہ صفی آباد رفتہ بود کہ ۱۰ فرسخے سبزوار است نزد بہ سبزوار۔ دہ بدنام آدمے ہست۔ اصل نامش حسین آباد بود۔ شخصے بود از آنجا برآمد۔ بجمع پول نامِ خود ابوبکر ظاہر کرد۔ ازاں روز بدہ بدنام شہرت گرفت۔ نادرقلی مرزا پسر شاہ عباس باشد قابل تحقیق ؂

بنا بر فساد در بارۂ آصف الدولہ حکم تعدیل بود مقدمہ
حاجی عبدالکریم روغن نفط بر آتش ریخت کہ می گفت پول
بہ تفاریق می دہم۔ آصف الدولہ بگفت قرضخواہان بزور
درد ادا و خود را بہ پست انداخت آئین نہ در گرفت حاجی
مرزا ابراہیم در مشہد بود۔ آغا محمد علی در سبزوار بود بہ سبب
نزاع برادران نزاع سخت است۔ بادشاہ ہم نوشت
مرزا محمد علی جواب انکار نوشت۔ آغا محمد علی کثیر البکا
صاحبدل آدم است۔ برخلاف آغائے بزرگ آغا محمد نقی
در تقوی و زہد از دہم فائق تر است آغائے بزرگ پست تر
بس نماز میکند در علم آغا بزرگ و آغائے محمد علی و این سید
از خانوادۂ بزرگ است با اینہا تعلق ندارد۔ ۵ برادر ہستند
(۱) حاجی مرزا ابراہیم شریعت مدار۔ (۲) حاجی مرزا محمد علی۔
(۳) حاجی مرزا عبدالکریم (۴) حاجی مرزا حسن (۵) حاجی

مرزا زین العابدین در مشہد است صاحب اجتہاد۔ سبزوار اصلش
شدہ گویند حضرت امام حسن کہ فارس را فتح کردند جناب امیر
علیہ السلام سفارش کردہ بودند کہ در آنجا کہ برسی شہرے
آباد است۔ نشان پرسید گفت دامنے برابر جوئے کہن و
جابجا بپرس چاپائے کہ ترا بسر شود ہمانجاست۔ چنانچہ ظہور یافت
و ایں حلیہ مدح است مدح خاکستر ہم بہ نفرین حضرت ع خاکستر
شدہ کہ در ہرات تا حال موجود است۔
۱۸ رجمادی الثانی یوم پنجشنبہ۔ شوراب۔ مزار مشتشار الملک
بنا کردہ ۱۵ سال می شود۔ آب انبار ہا ہمہ شور۔ مردم آب
از کاریز میخورند منزل ما زعفرانی بود مگر ما بہ سبب بارش بر در
رباط سرپوش منزل کردہ بودیم۔ آخر شب کوچ کردیم در راہ
راہ رو روشِ زعفرانی را دیدیم از دور قلعہ خوش نما نمایاں
شد۔ در کاروان سرائے آصف الدولہ پائین بود۔ کاروان سرائے

دور قدیم است۔ شاہزادہ حمزہ مرزا دوبارہ تجدید کرد۔ در راہ
از ہمراہیان آصف الدولہ چند قاتر مردہ خر در وحل شدند۔
کربلائے ملا حسن را ملاقات کردم۔

۲۰ر جمادی الثانی روز شنبہ۔ طاق کردن۔ مگر اصطلاح
اہل اصفہان است در اینجا ہم فصحائمی گویند۔ "سر بود"
بالا بود۔ ہر چہ در قیمت دو چیز زیادمی باشد۔ اما فصحا ر
بر سر اکتفا کنند۔ ملا عبائے خود را بہ عبائے بندہ عیوض کنید۔ پنج ہزار
سر بگیرید۔ عامہ گویند۔ ہر چہ سر بودش باشد۔ بما بالا بودش باشد۔
بگیرید۔ کندہ زانو بندِ زانو۔ جاہل دختر نوجوان۔ جیغ آواز و صدا
یک جیغ را بالا زست۔ مگر اصطلاح اہلِ صحرا و ایلات است
آغا مرزا مہدی شیرازی تلگرافچی حسن قلیخان سرہنگ رئیس
تلگراف خانہ در نیشاپور وطن دارند۔ حاجی محمد باقر خان معزول
مرزا محمد حسن مستعفی نائب الحکومت۔

مسجد جامع نیشاپور۔ تاریخ بنائے اصل مسجد ۸۹۹ھ بوده۔ که علی کرخی تعمیر کرده بود۔ و کُرخ بالضم دہیست از دہات ہرات مقابل توشنج که نیز دہیست از دہات ہرات۔ قبر علی کُرخی در زیر زینے با یوان دروازهٔ مسجد موجود است۔

آغا شیخ فضل الله صاحبزادهٔ آغا شیخ الاسلام۔ و آغا مُلّا روح الدین۔ ۴ برادر ہستند۔ آغا شیخ ابراہیم۔ آغا شیخ مذکور و آغا شیخ مسعود۔ آغا شیخ عبدالحسن۔ تقریباً صد و بست سال ست که بزرگان شاں از شاہجہاں آباد ہند و بمشہد رضوی تشریف آوردند۔ مُلّا رفعت و مُلّا عزت چوں در مشہد بلوائے اورنگ بود در نیشاپور سکونت اختیار کردند۔ اواخر صفویه و آغاز دولت قاچریه بود۔ ہر چہار برادر صاحب اخلاق کریمانه یادگار بزرگانِ خود ہستند۔

قبر شیخ فرید الدین عطار ہمیں جاست۔ در شہر کہنه نیشاپور

کہ بہ شہر مریم شہرتے دارد۔ و آں بنا، شاد باغ باشد۔ و شاد باغ۔ بادشاہی از سلاطین نیشاپور ہفت مرتبہ خراب و آباد شدہ گاہے برف خراب کرد۔ گاہے زلزلہ گاہے سیلاب۔ گاہے سنگ باران۔ پنجم گلگیر۔ ششم آواغر افغان شاہ درانی بودہ۔

تربت آباد۔ حالا دہیست کہ در آنجا عمارت الب ارسلانی است۔ بر بالائے تپہ و آبادی ہائے عالی محل و عمارات و حمام و غیر آں باقی ست۔

قبر فضل ابن شاداں تقریباً یک فرسخ راہ دور از شہر موجود است۔ بر قبل مطہر آں مرحوم نوشتند کہ شخصے و ارد جدید حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام را دید کہ کتابے ملاحظہ می فرمایند۔ پرسید۔ یا حضرت چیست کہ مطالعہ می فرمائید فرمود احادیثے است کہ فضل جمع کردہ۔ باز نگاہ می فرمودند

وصفحہ بہ صفحہ ورق ورق آن را میدیدند ومیفرمودند سزاوارست

کہ بایں کتاب عمل کنند۔ در مجلسے دیگر است کہ حضرت فرمود

رحمۃ اللہ افضل۔ رحمۃ اللہ افضل۔ رحمۃ اللہ افضل۔ بروایت دیگر

اغبطوا اہل الخیرات بہ مکان افضل۔

شیخ ابو الحسن شاہزادہ محمد محروق۔ بارگاہ خوبے دارد

امام زادہ ہست۔ و امام زادہا محمد باقر۔ شاہ سلطان حسین اصغر

وغیرہ و چند دیگر ہستند (شہرت عام ست کہ ۱۲ ہزار عُرف

دریںجا مدفون ست)۔

قبر نادر مشہد میں بمقام بالا خیابان ہے۔ مکان مذکور میں

قبابان خانہ ہے۔ ایک بڑا سا چبوترہ اُس پر نادر کشور گر پڑے

سوتے ہیں۔

میاب جے معمولی جگہ ہے یہاں سے میاں دشت ۶ فرسخ

معمولی راہ اور معمولی حالت۔

میاں دشت معمولی جگہ ہے یہاں سے عباس آباد ۶ فرسخ۔
عباس آباد۔ معمولی جگہ ہے۔ یہاں سے مزینا ۶ فرسخ راستہ میں پانی رود خانہ کا پھیلا ہوا تھا۔ قافلہ پر بہت تکلیف پائی۔ بیچ میں ایک پُل ۳ در کا کھڑا کیا مگر کیا فائدہ۔ اسے پُل ابریشم کہتے ہیں۔ مزنیاں معمولی جگہ ہے ۴ فرسخ نوروز تھا۔
سوو خوران ایک معمولی آباد گانو ہے ملاؤں سے ملاقاتیں کیں اور چند کتابیں خریدیں یہاں سے الوند ۴ فرسخ ہے۔
الوند۔ ایک معمولی گانو ہے ۴ فرسخ سبزوار ہے۔
سبزوار۔ ایک دن اتفاق رہا حال یہاں کا جُدا لکھا ہے۔ یہاں سے زعفرانی ۶ فرسخ۔ مینہ نے راستہ میں بڑی تکلیف دی۔
زعفرانی اس کا خوشنما عمدہ قلعہ دور سے نہایت خوشنما معلوم ہوا۔ پاس پہنچے تو اندر سے ویران آصف الدولہ مع ہمراہیوں کے

یہاں اُترے ہوئے تھے دیکھ کر خوفِ خدا آیا کہ ایک ساتھ اتنے آدمی روزگار سے جاتے رہے رستہ میں کیچڑ بہت تھی کئی خچر آصف الدولہ کے رستہ میں برباد ہوئے۔ یہاں سے شوراب ۵ فرسخ ہے۔

شوراب معمولی گانوٴ ہے۔ مگر افسوس یہ کہ تمام شور آب انبار تک شور ہے چشمہ اور کاریز کا پانی پیا کاروان سرائے مستشار الملک نے بنائی ہے ۱۰ سال ہوئے۔ درراہِ کربلا ملا حسن را ملاقات کردم۔ از شوراب تا نیشا پور ۶ فرسخ چال جدا لکھا ہوا ہے۔ نیشا پور سے قدم گاہ ۵ فرسخ۔

قدم گاہ معمولی آباد جگہ ہے آخر شب برف پڑنی شروع ہوئی اور ہم چل کھڑے ہوئے۔ رستہ میں وہ تکلیف اُٹھائی کہ مرنے میں کچھ فرق نہ تھا۔ رستہ میں ایک رباط میں اُتر پڑے۔ رباط سے ۴ فرسخ طے کر کے برف آباد میں پہنچے

معمولی آباد گانو ہے۔

برف آباد سے روانہ ہوئے تو تمام رستہ سفید تھا برف عالم گیر برسی ہے۔ رستہ میں چند چھوٹے چھوٹے آثارِ فرہاد پیش آئے اور چونکہ ایران کے رستوں میں خصوصاً راہِ مشہد میں تمام روئے زمین تختہ ہموار ہے۔ اِس لئے ظاہر کرنا واجب ہوا۔ جب قبہ مبارک نمودار ہوا دِل آب ہو گیا الحمدللہ عَلیٰ ذالک۔ ڈیڑھ فرسخ شہر رہا تو ایک دو ٹوٹے پھوٹے گھر اور ایک کارواں سرائے بخستہ شکستہ حال ملی۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام "طُرق" ہے اور یہی مقام ہے جو قصیدہ کے تیسرے شعر میں ہے کہ جد مرحوم پڑھا کرتے تھے اور اُن کے بستوں میں مختلف اس کی نقول نِکلا کرتی تھیں۔ کہ بہ نیتِ ثواب لِکھا کرتے تھے اور رکھ چھوڑا کرتے تھے تاکہ جس کے ہاتھ پڑے پڑھے اور ثوابِ عام ہو۔ وُہی فرمایا کرتے

تھے کہ یہ قصیدہ حضرت کے روضہ پر ایک دروازہ کی محراب میں سربلند ہوا ہے ؎

یارب ایں ارضِ مقدس چہ مقام است وچہ جاست
کز زمیں تا بہ فلک مظہرِ انوارِ خداست

جب تک طرق کے یہ حال معلوم نہ ہوں مذکور کیا سمجھ میں آسکتا ہے۔ میں اُن سے سنا کرتا تھا کہ اس مقام سے زوار پیادہ ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اُترا اور زمین کو بوسہ دیتا ہوا چلا۔ الحمدللہ کہ دل حاضر اور سینہ گداز تھا اور آنکھیں آنسو دے رہی تھیں زیادہ تر رونا اس مصیبت کا ہے کہ اب نہ ایسے خوش اعتقاد رہے اور نہ وہ درد والے رہے۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا اِلیہ راجعون۔

۲۴؍جمادی الثانی یوم دوشنبہ۔ مقام خاتون آباد منزل شد بد جائیست ہیچ نیافتیم کہ میخوردیم۔

۲۴ر جمادی الثانی یوم سہ شنبہ ، فرسخ طے کردہ بایوان کیف
رسیدیم بدجائیست برائے خورش ہم چیزے نیافتیم وایوان
ازاں گویند کہ درعہدِ قدیم شاہاں وامرا شگفتہ مزاج
دریں گل زمیں آمدہ ۔ برائے سرخوشی وکامرانی میداوند چنانچہ
تپۂ خام نما در پہلو آبادی ہنوز از ایوان مذکور یاد می دہد ۔

۲۴ر جمادی الثانی یوم سہ شنبہ کو واردِ شہر ہوا الحمد للہ
و شکر اللہ ۔

۲۵ر جمادی الثانی یوم چہار شنبہ ۔ از ایوان کیف
کوچ کردہ در راہ دہے اردون نام یافتیم ۔ دراں عمارا تے
مدور خیلے وسیع یافتیم کہ سہ منزلہ ساختہ براں ایوان ہائے
سکونت افراختہ بودند ۔ معلوم شد کہ ایں ہمہ تکلیف از
بیم ترکتازِ ترکماناں بودہ وایں را قلعہ گویند در دہ نمک منزل
شد ۔ از ایوان کیف قشلاق ۵ فرسخ از قشلاق دہ نمک ۶ فرسخ

در کاروان شاہ عباس راحت یافتیم۔

۲۶ رجمادی الثانی یوم ۵ شنبہ۔ دہ نمک دریں دہ ہم عمارت مذکور بنظر آمد۔ مراد علی نام ہمدانی را دیدم کہ از بخارا می آمد۔ دہ سال در آنجا بقید غلامی بود باز ۱۶ سال نوکری کردہ بادائے بہ چہل تومان پول خود از بند عبودیت رہا بندہ حالا وطن میرود در لاسگرد منزل شد

۲۶ رجمادی الثانی یوم ۵ شنبہ۔ فاتحہ شیخ بہائی علیہ الرحمۃ خواندم ولد شیخ عبدالحسن العاملی برادر زادۂ شان شیخ عبدالصمد در گوشۂ مقابل متوازی میخوابند۔ فوائد صمدیہ برائے ہمیں نوشتہ بُودند مگر در قتل گاہ شیخ طوسی علیہ الرحمۃ۔

ہو الحی الذی لا یموت

ہو الباقی و کل شیئ ہالک الا وجہہ

بدا المرقد شریف و المضجع المنیف للعالم الفاضل الکامل

حاوی الفروع والاصول جامع المعقول والمنقول افضل الفضل الابن
حسن المکی ابوعلی طبرسی تاب ثراه شیخ فضیلت مآب بوعلی
آں کو نداشت۔ ہفت شعر است مگر خوانده نشد محو شده
در آخر نوشته۔ قد توفی فی الشهر ۵۴۸ھ

درصحن کہنہ۔ مقبرہ مرزا جعفر بردم دروازه

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہذا المرقد العالم العامل المرحوم المغفور المقدس المسرور محمد
ابن الحسن الحر العاملی توفی واحد عشرہ فی شهر رمضان سنه
اربعه و مائه والف۔

۲۷ر جمادی الثانی یوم جمعه۔ لاسگرد۔ در کاروانسرائے
شاه عباس راحت یافتیم۔ دگول گھر موجود۔ ازینجا به سمنان
منزل شد۔ یک روز اتراق۔

۲۹ر جمادی الثانی یوم یکشنبه۔ سمنان۔ شہر مختصر بیست

مدرسہ دارد کہ دومی از مختصر مختصر تر مسجدے خوب دارد۔ حاجی مرزا محسن پیشتر پیش کردہ نام خود را بہ برج شہرت نوشتہ دریںجا بہ نبیرہ مرزا یغما کہ خلف مرزا اختر باشد ملاقات شد۔ قلیان و چلمہائے برنجی میاز د۔ افسوس افسوس۔ میراثِ پدر خواہی علمِ پدر آموز۔ روز دیگر با ہوان دہ رسیدیم۔ شہرت شہر کہ نام و نشانِ آں نیست شدہ۔ خیابانے ساختہ و مکانے حاکم نشین بلند افراختہ۔

سمنان تا اہوان ۶ فرسخ۔ یہاں تلگراف خانہ شاہی ہے

۳۰ جمادی الثانی ۲ شنبہ۔ اہوان سمنان و اہوان کے رستہ میں پانی بہت کم تھا۔ کنار آب خیلے تکلیف داد چوں ۳ فرسخ در منزل باقی ماند برف نمودار شد۔ قدم بقدم زمین ژرف بود۔ تا کہ بمنزل رسیدیم۔ آب انبار یافتیم سرما خیلے زیاد بود۔ دریں منزل از بابت سرما شہرت تمام دارد

منزل ویران سرائے شاہ عباس را حاجی علی نقی تاجر نو ساختہ در ۱۲۸۵ھ۔ در راہ برف یافتیم راہ نظر آمد باز زمین صاف شد مگر سرما غضب بود۔

توشہ۔ بالکل ویران۔ کاروان سرائے بدستور۔ محمد یوسف دکتور را دریں جا ملاقات شد کہ برسالہ غلامان شاہ دکتور ہستند

توشہ تا دامغان ۶ فرسخ۔

دامغان ویران شہر ہے کوئی علامت شہریت کی نہیں۔ کچے مکان کچی دکان کچا مدرسہ وہ بھی ویران۔ سرائے شاہ سلیمان صفوی کے عہد کی ہے۔

دامغان سے دہ ملا ۷ فرسخ۔ راہ خوب اور گرم۔

دہ ملا شاہ رود۔ راہ بہت خوب یہاں بھی ویرانی نے مسکن بنایا ہے مگر بادشاہ کے نئے بازار نے باہر اور اندر رونق کر دی ہے۔ ایک تنگ سا مدرسہ ہے۔ شاہ رود میں

تلگراف خانہ شاہی ہے۔ اولائٹی صاحب یہاں ملے بڑے خوش
ہوئے۔ اور معلوم ہوا کہ انگریزی خبریں شاہی تار کی وساطت
سے انگریزی میں آتی ہیں۔ اُجرت ادا کر دی جاتی ہے۔ یہاں
ابروباراں نے ۳ دن ہلنے نہ دیا۔ چوتھے دن برستی برف
میں چل کھڑے ہوئے کہ میابجے ۱۰ فرسخ ہے۔ رستہ میں سردی
نے عقل گُم کر دی۔ دو فرسخ چل کر خیرآباد میں اُتر پڑے۔ دوسرے
دن پھر کوچ جانب میابجے۔

از مشہد تا ہرات

(۱) ۵ شہر رجب ہفتہ کو مشہد مقدس سے کوچ کیا ۳ کوس چل کر
سرسلام نظر آیا پھر کر زیارت کی اور روتا آیا۔ شام کو رباط بربری
میں دو ساعت ٹھیر کر دانہ پانی کھایا پیا اور چونکہ بڑا حصہ کاروان کا
صبح چلا گیا تھا اور دو گھنٹے بعد روانہ ہوئے۔ ہوا سخت تھی اور

ٹھنڈی تھی۔ حیران تھا کہ رات کیونکر کٹے گی۔ اللہ نے قدرت نمائی کی۔ آدھی رات کو سنگ بست پر پہنچے کہ یہ بھی حسب معمول منزل ہے اور آباد گانوٴ ہے جابجا آب زلال جاری چلے جاتے ہیں (۲) سنگ بست سے قدم اُٹھائے چلے گئے اور دن نکلے خیر یمانی میں پہنچے کہ دوسری منزل ہے۔ یہاں آباد آبادی ہے۔ ملا محمد علی ایک عالم فاضل صاحب عرفان شخص ہیں۔ گھر میں بیٹھے لڑکے کو شرح لمعہ پڑھا رہے تھے۔ اور خوب پڑھاتے تھے میں نے پوچھا کہ مشہد مقدس میں آپ کیوں نہیں بیٹھے۔ فرمایا ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را۔ بیٹے کی ۱۴ برس کی عمر تھی سبق پڑھ کر اُٹھا تو تھوڑی دیر کے بعد دیکھتا ہوں کہ گھر کی دیوار پہ چڑھ رہا ہے۔ اور یہ عام حالت یہاں کے شرفار اور علمار کی ہے۔ مگر کیا اچھی حالت ہے ؎

صحرا چہ خوشست در ندارد   مفلس چہ خوشست در ندارد

ہمیں رات دن کام سے کام ہے
طبیعت میں اپنی تکلف نہیں

(۳۳) خیبر بجانی سے کوچ کر کے خیرآباد میں منزل ہوئی۔ خیرآباد ویران ہے۔ کاریز سامنے تھا۔ آباد ہے۔ ضروریات سے انڈے دودھ۔ دہی مل جاتا ہے۔ لوگ اچھے ہیں یہ بات قابل بیان ہے کہ اب تک ہر آبادی میں کل اشخاص شیعہ ملے تھے اور سوا علیؑ علیؑ کے دوسری آواز نہ تھی۔ اس منزل سے ہر ایک گانو میں شیعہ سُنّی ملے جُلے ملنے لگے۔ مگر سب شیر و شکر ہیں کچھ فرق نہیں۔ رات کو میں اونٹ پر سے اونگنے میں لڑھک گیا سر اور گدّی کے بل گرا تھا۔ مرنے میں کچھ باقی نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت کہ سر بال بال بچا۔ زیادہ تر پشت دونوں پہلو اور سینہ پر صدمہ پہنچا۔ مجھے پھر اونٹ پر ڈال کر لحاف اوڑھایا اور رسّی سے کس دیا۔ سب کو خیال تھا کہ مر کر رہ جائے گا۔

صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر رسّہ کھولا اور مجھے آواز دی۔ میں نے کہا تو کیستی۔ شتربان نے نام لیا۔ مجھے گودی میں اُتارا اور بستر پر لٹا دیا۔ تین دن عجیب حال رہا۔ کھانا بھی دُکھ دیتا تھا۔

(۴) لنگیر میں منزل ہوئی۔ آباد گانو ہے۔ یہاں ایک شخص امر شاہ نام گانو کی مسجد میں اُترا۔

زرعان باز دارد۔ اسباب ضروری برائے غذا بہم رسد یک روز مارا توقف رو داد کہ قافلہ دیروزہ روانہ شدہ بود قاطرچی گفت من نتوانم بروم۔ مال من ضعیف است۔ میان زرعان و کنار راہ ہمہ گل بود کہ سرزمین برنج کاریست۔ برائے ملاقات مُلّا آخوند رفتم۔

شہر ہرات کی حالت ویرانی میں قابلِ تحریر نہیں۔ البتّہ

مقدمات لکھنے کے قابل کہ بالاے حصار کا مقام بلندی اور ہواداری اور خوش نظری میں قابلِ تعریف ہے۔ پائین حصار کا میدان اور مکانات اُس سے زیادہ رونق رکھتے ہیں۔

شہر کے اندر مسجد جامع کی رفعت اور علوئے شان دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ یہ مسجد اصل میں گوہرشاد بیگم نے بنائی تھی اسکے بعد سلاطین تیموری کی باہمی ٹکّروں نے پامال کردیا۔ ۹۰۴ھ میں ویران ہوگئی پھر میر علیؓ ببر نے مرمت کی۔ جسے نئی تعمیر کہنا چاہیئے دو رُباعیاں گوشۂ جنوبی پر دو گواہ ہیں۔

رُباعی

مقصورہ و طاق جامعِ شہر   گردیدہ خراب بود از دہر
شد امر زغیب و گشت تاریخ   وقفِ بنائیہ علی ببر
۹۰۴ھ

این صفحہ کہ ماندہ بود چوں عظیم رہیم — ماندۂ کعبہ یافت احیائے عظیم
تاریخِ عمارتش ز دل جستم گفت — ثانیِ بنائے طیبِ ابراھیمؑ

اِس مسجد میں ایک فرمان کندہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ بموجب عریضہ خالی خان سردار عساکر و بیگلر بیگی کل خراسان سالانہ یک صدو پنجاہ تومان از وجوہ راہداری مالکولات و تدغیچیگری و دروازہ بانی وغیرہ وغیرہ و چہل تومان وجہ انگشت خانہ بر ترغیب سکنہ و متوطنین قرئے و بلوکات وغیرہ وغیرہ بنرغیب علوم و صرف عبادات وغیرہ معاف گردید۔ ۱۱۰۶ھ

اس کے نیچے ایک اور فرمان ہے جس کا خلاصہ ہے شاہ ابو الغازی سردار ایوب خان۔ فرمان میدہد کہ چوں طائفہ غوری نسب خود را بہ حضرت سیّد بندہ نواز گیسو دراز رسانیدہ اند کہ سلسلۂ شاں بحضرت امام جعفر صادق می رسد لہذا از وجوہ محصولات مقررہ بری شدند ۱۲۹۸ھ۔ اس کے

نیچے ایک اور فرمان ہے یعقوب خان کا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ چوں ملک موروثی از دست رفتہ باز آمد موسیٰ خان ولی عہد را باید کہ بشکرانہ آں وجوہ محاصل از بزازی وبقالی و دباغی و صباغی و زرگری و رنگریزی وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ بر کافہ رعایا رحمت و شفقت چناں و چنیں و چناں مبذول فرماید ۱۲۹۹ھ۔

اسی در کے آخر میں بڑی بڑی سلیں سنگ مرمر کی ہیں آدھے آدھے ٹکڑے گم ہو گئے۔ آدھے آدھے کہ بے ربط ہیں جوڑ دیئے ہیں۔ وہ مشتمل معافی رقومات سالانہ ہیں۔ اور غالباً کسی صفوی بادشاہ کے عہد کے ہیں۔

شہر میں چارسو کے پہلو میں خشک بازار کا رستہ مشرق رویہ سیدھا چلا جاتا ہے۔ چارسو کے پاس ایک بڑا آب انبار ہے۔ یہاں حوض چارسو کہلاتا ہے۔ تمام شہر اسی کا ٹھنڈا اور

صاف پانی پی کر دل ٹھنڈا اور سینہ صاف کرتا ہے۔ اس پر بھی فرمان شاہ صفی مرحوم کے عہد کا لکھا ہے۔ خلاصہ یہ کہ چوں بردر شاہ مدحت پناہ برخاک خراسان افتاد بہ تصدیق فرق مبارک رقم برکار رعایا معاف گردیدہ ۱۰۴۸ھ

مسجد کے اندر بھی ایک فرمان نہایت عمدہ خط ثلث میں مرقوم ہے مگر پڑھا نہیں جاتا۔ اور چونکہ پہاڑی ملا مسجد کے اندر دروں میں حجرے بنا کر رہتے ہیں اور اکثر موجود ہوتے ہیں اُن کے ڈر کے مارے غور سے دیکھ نہ سکا کہ ابھی کوئی آ کھڑا ہو اور ایک چھرا مارے تو کیسی خرابی ہو اور جان مفت جائے۔ اُن کے نزدیک گاؤ اور آدمی کا کاٹنا برابر ہے فقط اتنا کہدینا کافی کہ آدم بیرنگی بود کافر بود۔ کہ میداند کہ گشتہ است بس رفت و گذشت پھر کون پوچھتا ہے۔

شہر کے دروازہ پر بھی۔ ایک ایسا ہی پتھر لگا ہوا ہے۔

وہاں سپاہیوں کی کمپنی رہتی ہے۔ تمام خیبری۔ لوگری غلزی آنکھ اُٹھا کر دیکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

شہر کے باہر ایک میل راہ مشہد پر دست راست امام زادہ قاسم کا مقبرہ ہے۔ یہ حضرت امام علی ابن موسیٰ رضا کے اولاد میں تھے۔ وہیں سید حسین کا روضہ ہے۔ شہر ہرات شہزادگان تیموری کی بس قسمت آزمائی کا دنگل رہا ہے ۹۰۰ھ سے ۱۰۰۰ھ تک۔

آگے بڑھ کر ایک عالیشان میناروں اور گنبدوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے گنبد گرے اور گرائے گئے۔ مگر شان و شکوہ کو کوئی نہیں گرا سکا۔ محرابیں ان کی رفعت اور بانیوں کی ہمت اور معماروں کی صنعت پر محضر بنائی ہیں۔ اور چینی کاری رنگینی گل مخمل اور بانات کو مات کرتی ہیں۔

یہاں مسجدیں اور گنبدوں میں شاہزادگان تیموری کی قبریں تھیں اُن کے سنگ موسےٰ کے تعویذ اب تک پڑے ہیں۔

ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم سلطان بن علاؤالدولہ ابن سلطان باستقر سلطان شاہرخ سلطان ابن قطب الدنیا والدین امیر تیمور گورگان جعل اللہ الجنۃ مثواہ ۸۶۳ھ

(۲) باستقر سلطان ابن شاہرخ سلطان ابن تیمور ۸۳۶ھ

(۳) سلطان احمد ابن ہرمز بن عبداللطیف ابن شاہرخ ابن تیمور ۸۴۸ھ۔

(۴) علاؤالدین ابن سلطان غیاث الدین ابن باستقر ابن شاہرخ ۸۶۳ھ

(۵) شاہرخ سلطان ابن امیر النشاہ ابن تیمور ۸۹۰ھ

(۶) گوہر شاد استغف رمضان ۸۶۱ھ

در درجہ وسط کہ کنار شاہراہ شدہ وایں درحقیقت مدرسہ وعیدگاہ بود یک فرسخ مرمر بزرگ خیلے با زینت و باسامان نظر می آمد مگر ہمہ شکستہ وریختہ وغالباً ہمیں قبر سلطان حین باستقر است

و بر دست راست او ست غیاث الدین بن باستغر سلطان ابن عمر شیخ - ۸۴۳ھ -

آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ پر ایک بڑا احاطہ ہے اس میں چار قبریں ہیں ایک میں مولانا جامی سوتے ہیں۔ ایک میں مولانا صدر الدین ان کے استاد ایک میں ہمدم اُن کے دوست محبوب ایک میں بھانجہ مدفون ہے - بڑے احاطہ میں ایک آب انبار ہے - اُس کی پشت پر مُلّا حسین واعظ کاشفی صاحبِ تفسیر حسینی ہیں -

اس کے کچھ فاصلہ پر امام فخر رازی ہیں -

مولینا جامی سے آگے بڑھ کر چٹیل میدان میں ایک گنبد نظر آتا ہے اس کے برابر وزیر یار محمد خان مدفون ہیں -

گازرگاہ

یہاں شیخ عبداللہ انصاری کی قبر ہے - اور ان ہی کی

برکت سے مقام مذکور پر شہر خموشاں آباد ہوا ہے۔ امیر دوست محمد خان سلطان احمد خان۔ اس کی بیگم یعنی دختر امیر مرحوم سب یہیں آرام کرتے ہیں۔

روضہ باغ۔ آنزوے آب یعنی درپائے ہرات کہ بادشاہزادہ کامران اور اس کے باپ وغیرہ شاہزادگان سدوزی اور اکثر اُمرا ہیں۔

ابوالولید کی قبر شہر کے باہر مولوی جامی کی قبر سے جانب مغرب جنوب ہے مگر لوگ کہتے ہیں۔ کوئی نشان نہیں رہا جس سے تصدیق ہو کہ یہی ہے ۲۳۲ھ۔

اسی نواح میں ملا حسین واعظ کاشفی کی قبر ہے جنکی تفسیر حسینی سب سے زیادہ مشہور ہے اور انوار سہیلی درس میں داخل ہے ایک قبر پر اس طرح لکھا تھا۔ باباحسین ابن بابا محمد ترکستانی ۸۵۱ھ مگر لوگ ملا حسین واعظ کا دھوکا کھاتے ہیں مگر یہ اور ہیں۔

(۵) آغا سیّد علی اکبر۔ اردکانی و این اردکان توابع فارس است
نه یزد۔ سابق درس میداد حالا بباعث ضعف پیری تارک است
و بر امامت مسجد حاجی مرزا هادی فارغ نشسته قریب به هفتاد عمر
باشد۔ خدا زیاد کند۔ در علوم معلومه دستگاه عالمانه دارد۔
از کربلا و نجف استفاضه فرموده۔

(۶) آغا سیّد علی اکبر موالی که از طائفه موالی هستند عالم علوم است
خصوصاً در علم فقه و اصول و قرئت که فرید وقت است۔ درس کمتر
میدهد۔ خانه نشین است۔

(۷) حاجی شیخ عبدالجبار جهرمی (از توابع فارس سی فرسخ جنوب شیراز)
فقه و اصول در مسجد حاجی مرزا محمد امامت دارد۔ قیاس گوید عمر
قریب ۵۰ و در مدرسهٔ مرحوم حاجی قوام شیرازی مدرس است۔ ۶۰
۷۰ تومان وظیفه دارد۔ در کربلا کمتر خدمت شیخ و بیشتر به تلمذ حاجی
مرزا محمد حسن استعداد و رزیده مرجع طلاب و اهل تحصیل است۔

(۸) شیخ محمد باقر اصطہباناتی (این دہے از قصبات فارس از شیراز سمت مشرق تقریباً سی و پنج فرسخ) جامع علوم است معقولاً و منقولاً خدمت علمائے طہران تحصیل نمودہ از پنجاہ متجاوز نباشد افسوس کہ طالع ندارد۔ مردم شیراز بجاش نپردازند۔ چہ خاص و عوام چہ طلاب۔

باقی علما بسیارند مگر قابل شمار نیستند قدرے حکمت الٰہی ہم بدہ۔

(۹) حاجی شیخ محمد طاہر عرب از دہات بصرہ است۔ زیادہ ۲۵ سال ست کہ سکونت در شیراز دارد مدرسی و امامت در مسجد حاجی قوام کند امّا چنداں مرادوہ بہ سائر علما ندارد۔ زیرا کہ قدرے فضول ست یکے از انست کہ قائل بودہ بہ امامت مہدی سودانی کہ در بر سودان ۲۲ شعبان ۱۳۰۲ھ مردہ بمرض آنکہ سیاہ مردہ۔ و بندہ خبرش در بوشہر و بائی کرنیل راس شنیدم۔

در کربلا و نجف غیر از علم فقہ و اصول و تحصیلے مقدمات دیگر علمے رواج نیست و لے در طہران علوم معقولہ از کلمہ و ہندسہ حساب و ہیئت و کلام و جغرافیہ و غیرہ رواج است۔ اگر کسے بخواہد باید بہ طہران برود و تحصیل نماید۔

یہاں ایک شخص اترا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ میں بڑا فاضل ملا ہوں اور طبیب بھی ہوں۔ اصل وطن میرا کشمیر ہے۔ برودہ میں مہاراجہ ملہر راؤ کے پاس خدمت وزارت سرانجام کرتا تھا جب سرکار نے اُسے ریاست سے بے حق کیا تو میں نے فوج کشی کا بند و بست کیا دس ہزار کا لشکر جمع کیا۔ راجہ اور خیر خواہان ریاست نے روکا۔ میں وہاں سے روپوش ہو کر بھاگا اور بمبئی کے راستہ یہاں آیا۔ شاہزادہ وقت سے پیام و سلام کیے انہوں نے جواب میں کہا کہ بر وقت تم حاضر ہونا اُس وقت دیکھا جائے گا۔ جواب موجود ہیں۔ فراخ پاشا افسر ذوالقا سلیم بیگ

نتو ذبح بتر لور وغ یہاں سے تیسرے پہر کو کوچ کیا۔ پچھلے پہر تربت میں پہنچے۔ یہاں رباط شاہ عباسی ویران و شکستہ پڑی ہے۔ بارہ تیرہ برس ہوئے یہاں کے کل کل آدمیوں کو باندھ کر لے گئے تھے جب روسیوں نے مرو لیا تو انہیں چھوڑا اب چند سال سے وہ لوگ آکر آباد ہوئے۔

(۵) تربت حقیقت میں شہر جام ہے جہاں شیخ جام اور مولینا عبدالرحمن جامی جیسے بزرگ خواب عدم سے بیدار ہوئے اور قالب خاکی کو چھوڑ کر دریائے عدم میں غوطہ مار گئے۔ آج وہ نامی شہر ایک ویران گانو ہے جس کے کھنڈر بھی کچی اینٹوں کے ہیں شیخ جام وہی شخص ہیں جن کے لئے خواجہ حافظ نے کہا۔ع

حافظ مرید جام جم است اے صبا برو
وز بندہ بندگی برساں شیخ جام را

اور خاص و عام حضرت شیخ جام کو فیل مست اور فیل خدا کہتے ہیں

مزار ان کا پہلے سلطان سنجر نے بنایا تھا۔ وہ ناتمام رہا۔ پھر شاہ عباس نے دو ایوان عالیشان بلند کئے اور آب انبار عمدہ بنایا کہ اب تک قائم ہے۔ یادداشت وقت کے لئے یہاں کے ایک عالم کی زبانی ایک قطعہ لکھا تھا وہ کافی ہے

قطعہ

وفاتِ شیخِ اسلام احمدِ جام ۔۔۔ ز ہجرت پانصد سی سال و شش بود

ولادت چارصد بود و چل و دو ۔۔۔ نود با چار سال از عمر خَش[۱] بود

اُن کی تصنیفات ۱۴ میں سے جو نام لکھوائے یہ ہیں روضۃ المذنبین۔ انیس الطالبین۔ مفتاح النجات۔ کنوز الحکمت بحار الحقیقت۔ رسالہ سمرقندی۔ کلیات منظوم۔ ان میں سے فقط ایک کتاب مقامات ہے کہ جام اور اطرافِ جام میں ملتی ہے۔ جب میں زیارت کو گیا تو دیکھا کہ اُن کی قبر کے گرد

---

[۱] خوش۔

ایک کٹہرا بھی ہے۔

مولینا جامی کا حال افراط شہرت کے سبب سے قابلِ تحریر نہیں ہے۔ مگر اتنا بھی نہ لکھا جائے تو ظلم ہے۔

یہاں میں نے سُنا کہ دو ہندی آئے ہوئے ہیں۔ پتہ لگاتا ہوا پہنچا۔ دیکھا کہ حلیم خاں جمعدار رسالہ نمبر ۲ ساکن خیبر کیمپ سے کار سرکار پر آیا ہے اور مرزا عبداللہ و عبدالصمد خلف مرزا عبدالرزاق قندھاری اُترے ہوئے ہیں یہ دونو نوجوان اخبار نویس سرکاری ہیں۔ انھوں نے مشہد میں تحصیل علم کی ہے۔ مرزا عبدالرزاق قندھاری الاصل ہے اور خود سرکار کی طرف سے مشہد میں اخبار نویس ہے۔ یہاں شیخ عبدالرحمن خان کہ شیخ احمد جام کی اولاد سے ہیں۔ اور اُن کے کام اور کلام کو خاص و عام میں بڑا اثر ہے۔ اُنکے باغ میں یہ سب اُترے ہوئے ہیں۔ قطعہ خوش خط نستعلیق

حروف میں لکھا ہے۔

قطعہ

مرشد نامی شیخ گرامی احمد جامی عمت برہٗ

سالِ وفاتش گر تو بجوئی احمد جامی قدس سرہٗ

حررہٗ محمد معصوم بکری نامی سنہ ۱۰۱۴ھ

دیکھو یہ وہی بزرگ ہیں جو تاریخ طبقات نظامی کی تصنیف میں مرزا نظام الدین بخشی کے معاون تھے اور خود تاریخ بکر وغیرہ کتب کمناب کے مصنف ہیں غالباً اس خیال سے کہ اکبر کی ماں شیخ جام کی اولاد تھیں اس کی خوشی کے لئے اُنہوں نے یہاں ترمیم وغیرہ کی ہوگی اور یہ قطعہ منقوش کیا ہوگا۔

یہاں سے جانبِ شمال سفید روان ایک شہر قدیم کے آثار دامن کوہ میں اب تک باقی ہیں اب اس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ کاریز ایک معمولی گانوٴ ہے مگر یہاں کے چند شریف ملقب بہ

سلطان اپنی قدامت کو حقدار محصول راہگذر کا سمجھتے ہیں افغانوں
نے اسے دبا لیا ہے۔ پھر بھی جب موقعہ پاتے ہیں لے بیٹھتے ہیں
تربت سے کاریز میں آئے رات کو بڑی برسات کھائی
اور ہر قدم پر کہتا تھا خدا کتابوں کی خیر کرے۔ یہاں یعقوب سلطان
ایک مرد شریف سے ملاقات ہوئی۔ میں اپنے کپڑوں میں سے
جوئیں چُن رہا تھا۔ وہ مع اپنے نوجوان فرزند کے میرے پاس
آن بیٹھا۔ اور چند تقریروں میں ایسا محبت کرنے لگا کہ مجھے
اُٹھا کر گھر لے گیا۔ رات کو اور دوسرے دن صبح کو کھانا کھلایا
اُس سے مجھے دو ناقص کتابیں ہاتھ آئیں کہ غالباً عنصری اور
جامع۔ یہ کتابیں وہ مجھے بلکہ کسی کو نہ دیتا لیکن میرے پاس
ایک ہاتی دانت کی سُرمہ دانی تھی وہ دیکھ کر پسند کر چکا تھا
اور مجبور بھیجنی پڑیں۔

کاریز سے بعد عصر کوچ ہوا۔ ارادہ تھا کہ رباط روزنک پہ

اتریں گے۔ مگر راستہ میں مینہ برسنا شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ زمین ایسی خراب ہوئی کہ اونٹ پھسلنے لگے۔ سردی سے ہمارے دم بند ہونے لگے۔ پچھلا پہرا تھا کہ ایک میدان میں اتر پڑے بوجھ اوپر تلے آگے پیچھے لگا کتابوں پر غدّے ڈالے۔ آپ توکّل بخدا بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ پاؤں میں حس و حرکت نہیں۔ اٹھ کر ایک رفیق کو جگایا۔ وہ نمدوں میں گرم پڑا تھا۔ مگر اٹھا اور اِدھر اُدھر سے گھاس پھوس لیکر آگ جلائی کچھ دل بہلا کچھ آگ کے نام سے سہارا ہوا دو تین آدمی اور آگئے پھر آکر بیٹھ رہا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ ۱۰ بجے آفتاب نکلا۔ سُوکھے رُوکھے ٹکڑے چبائے اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ ایک کارواں زوّار ہرات سے مشہد کو جاتا ہوا گذرا۔ میں رستہ کے سرے پر انہیں دیکھ رہا تھا کہ ایک سردار نے مجھے ٹوکا اور چند نوکر اُس کے مجھے دیکھنے لگے۔ پوچھا کہاں جاتے ہو میں نے کہا ہند

اُس نے کہا کہ جس رستہ آئے ہو اُسی رستہ چلے جاؤ۔ مَیں نے کہا اس میں تو مجھے بڑا ہرج پڑے گا۔ مَیں ضعیف آدمی۔ کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا تو ہمارے ساتھ چلے چلو۔ پھر ادھر سے تمہیں جانا ملے گا۔ مَیں بہت حیران ہوا۔ اور کہا کہ پاسپورٹ حاضر ہے جب وہ دکھایا تو پڑھا اور مجھے باعزاز رخصت کیا۔ وہ محمد اکبر خان حاکم کوہستان تھا۔

(۷) رفیقوں نے ٹلم ٹلم کر کے پھر شام کردی اور کوچ ہوا۔ مغرب کے وقت رباط اوزنک پر پہنچے اور آگے چلے آدھی رات ہوئی تھی کہ پھر منہ ترشح ہوا میری عجیب حالت تھی کتابوں کی طرف سے جانی تکلیف۔ سردی اور ہوا کی طرف سے جسمانی تکلیف۔ خدا خدا کر کے تیر پل پر پہنچے۔ رفیقوں نے یہاں اپنی کارسازی کی اونٹ بٹھائے اور باج گیروں کی آنکھوں میں ایسی خاک ڈالی کہ ایک اونٹ لاد پھاند کر اوپر اوپر غائب کر دیا

کسی کو خبر نہ ہوئی۔ غرض کہ مینہ میں بھیگتے کیچڑ میں گرتے پڑتے رباط پر پہنچے۔ یہاں مرزا رکبر خان ولد کریم داد خان ایک میانہ سال جوانمرد با جگری کا کام کرتا تھا رات کو آرام لیا۔ صبح کو ایک قافلہ نے اس سے حساب کتاب کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس کچھ محصولی مال نہ تھا۔ پاسپرٹ دکھایا پہلے سے زیادہ مُروّت و انسانیت کے ساتھ پیش آیا۔ اور ایک قافلہ اور میرے شتربان نے جو قران بدرقہ کا میرے ذمہ ڈالا تھا وہ بھی مجھ سے ٹالا اور ان پر ڈالا۔

شام کو تیر پل سے رخصت ہوئے۔ صبح ہونے تک ایک مقام پر منزل ہوئی۔ کہ دو برس ہوئے یہاں رباط موبرک تھی اب صفن صفا ہو گئی ہے افسوس ہے عمل داری افغانی میں کوئی خبر نہیں لیتا۔ عبدالرحمٰن خان غالباً کچھ نہ کچھ بندوبست کریں گے۔ سامنے موضع مبرک آباد ہے۔ چند گھنٹے یہاں ٹھیر کر

شہر کو روانہ ہوئے کہ اہلِ قافلہ اور شتربان کو اپنے اپنے گھروں کا اشتیاق بیقرار کر رہا تھا۔ رستہ میں دستِ راست پر ایک بُرج خام ملا کہ بُرج شاہ رضا مشہور ہے۔ اسے سلام کر کے گلاب کاششی کو (ایک قلعہ آباد ہے) دیکھتے۔ شام سلمان (ایک گانو) دہنے پر چھوڑتے ہوئے زیرِ شہر آن کھڑے ہوئے دروازہ بند تھا۔ باہر پڑے رہے۔ یہاں ہمارے شتربان نے اپنی کارسازی سے محصولیوں کی آنکھوں میں خاک ڈالی۔ اونٹ اندر اندر گھر میں بھیج دیا۔ اندھیرے منہ دروازہ کھلتے ہی شہر میں داخل ہوئے اور سرائے حاجی عبدالرسول میں اُترے۔ رفیقوں کے لئے یہاں گھر کا معاملہ تھا۔ جو کچھ کیا کسی پر نہ کھلا۔

کنار صلش کنار مرواست وہمیں بود کہ در عہد سلف اسطخر نام داشت تخت جمشید و نقش رستم دریں جا الی الآن برائے اہل نظر مقام عبرت است۔

تصویر رستم - بر رخش سوار است ارتفاع آں معہ اسپ بقدر دو بالا آدم یا زیاد - پیش او پہلوانے دیگر استاد است حلقۂ فولادی درمیان است - ہر دو بر آں زور آزمائی می کنند نامش رستم کلہ دست است یعنی دست محبوبئے یرا کہ انگشتہایش بریدہ اند -

پس پشت رستم پہلوانے دیگر است از رستم ہم کلفت تر کہ میخواہد دختر میرا ببر د پدر دختر آمدہ دخترہ را گرفتہ است - ہر دو دست در کمرش زدہ کہ دست راستش بر زیر نافش رسیدہ بہ ہمیں ذیل طاق ہائے بلند بطور سیچ بودند کہ بسیارے منہدم شدہ اند و دو سہ تا باقی ہستند و ہم چنیں پہلوئے دیگرش غالباً یک اطلاق باقیست بہ ہمہ ذیل سابقہ یعنی پشت رستم کہ جانب شرق باشد سر دیوار تصاویر ما نو صحرائے ہم کشیدہ اند و بعضے مردم کہ استادہ اند یا نشستہ و بعضے رقص می کنند بہ فاصلہ دو صد قدم

یا سہ یک طاق مربع ۱۰×۱۰ واقعہ شدہ بجنسہٖ مثل خانہ کعبہ گویند آتشکدہ بودہ مگر خانہ کعبہ دو ستون دارد۔ ایں صاف یکدست مسقف است۔ دروازہ ایں ۱½ یا ۱⅔۔ عرض و یک قد آدم ارتفاع۔ خانہ کعبہ شرقاً و غرباً ۱۴ ذرع۔ جنوباً و شمالاً ۱۶ ہست۔

آں بروی آب کہ میانہ جاریست تخت جمشید واقعہ شدہ مربع منارہ بلند نصب کردہ بودند۔ منارہا باقی است لے است چپ ایں ہم دو سہ ہیچ باقی است۔

منزل ویران و بہ آب و غذا بہر نوع تکلیف کہ یافتم جائے نیافتم۔

یہاں صاحب انسپکٹر مدارس کراچی بھی ملے مگر گھبرائے ہوئے تھے کہ کچھ بات نہ کی۔

(۴۳) سیوند۔ آب جاری دارد مسجد خام دلکشا مگر آب و طعام

ہیچ حنسر بزہ ہا دارد دیگر ہیچ ہیچ۔

(۴) وہ نو۔ رشتہ جنگل تھوڑی چڑھائی کے بعد ایسا مقام آیا۔ کہ پہاڑ میں شگاف تھا۔ سوار بھی مشکل سے جا سکتا تھا۔ ہم بھی اترے گدھوں کے قافلے بیچ میں تھے ہم مشکل سے گذرے۔ داہنی طرف پہاڑ کا ڈھلان تھا۔ پانی بہتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک جگہ دیکھا کہ اونٹ کو اتار رہے ہیں وہ خرابی راہ کے سبب سے گر پڑا تھا سوائے قتل کچھ چارہ نہ تھا آس پاس کے لوگوں کی غذا ہوا۔ دو تین سپاہی راہداری کے لئے رہتے ہیں انہیں بھی خدا نے رزق بھیج دیا۔ راستہ میں ایک جگہ عمارت سنگ مرمر کی ملی چھت دو ڈھلوان سطحوں سے مرکب تھی۔ کہتے ہیں کہ مادر حضرت سلیمان کی قبر ہے۔ ایک بڑا تہ خانہ اس سے بڑھ کر ہے۔ ویران گانو پڑا ہے۔

ایک میل آگے بڑھکر ایک چبوترہ اور چند ستون بلند ایک

پتھر کے کھڑے ہیں۔ چبوترہ تخت سلیمان اور دہ سلیمان کہلاتے ہیں۔ ۴ میل بڑھ کر دہ نو پر منزل ہوئی۔

(۶) دہ نو ویران جنگل گانوٴ ہے ۵۰۔۶۰ برس سے آباد ہوا ہوگا کوئی چیز کھانے کو ملے تو مشکل سے۔ اس مقام راہ میں آدمی سیاہ افسردہ کوتاہ قد ہیں۔

جنگل کی گھاس شترخوار (جوانسا) یا وہی گھاس جسے ہند میں سرکا مصالح کہتے ہیں۔ گدھے بھی تمام سیاہ ہی سیاہ ہیں تھوڑی تھوڑی دور ہینگ کے درخت بھی ملتے ہیں۔

(۷) خان کرنمان۔ یہاں شاہ عباس کی عالیشان کاروان سرائے ہے۔ آجکل حاجی معصوم علی اس کی مرمت کرواتے ہیں۔ دو تین گولی کی مار پر ایک پل بھی اسی عہد کا ہے اس کی مرمت ہوگئی حاجی بے نظیر آدمی ہے مجھے جگہ رہنے کو دی۔ ایک تسبیح ایک سجدہ گاہ بھی دی۔

(۸) خان کرمان سے چل کر

وہ بیکہ ہمیں رستہ میں آیا۔ یہاں ایک بڑا خرابہ منہدم پڑا تھا
زمین سے ہموار۔ کہتے ہیں کہ قصبہ بہرام گور تھا۔ قلعہ سبز نام تھا
یہاں ایک طلسم بھی تھا کہ اب تک اس کے سبب سے وبا اثر
نہیں کرتی۔ ایک سرائے شاہ عباسی ہے مرمت طلب۔
تلگراف خانہ درست موجود ہے۔ خان خرہ پر منزل ہوئی۔ اچھی
جگہ نہیں۔

(۹) سرمق۔ اچھی جگہ ہے۔ بڑا قلعہ تمام گرد فصیل۔ اندر آبادی
یہاں بھی دستِ راست پر قصر بہرام ہے۔ یہ ایک ٹیلہ نظر آتا
ہے۔ کہتے ہیں کہ سات قعر تھے۔ قلعہ سبز۔ قلعہ کبود۔ کوشک زر
قلعہ گبر۔ قلعہ کافر۔ قلعہ مشکون (مشکن) یہاں سے علاقہ ابرغو، فرسخ
سے شروع ہوتا ہے۔ جانبِ مشرق۔ اسے پہلے شہر سفید کہتے

تھے۔ قوم ثمود کی آبادیوں میں سے تھا۔ اُس کے پہلو میں پہاڑ پر ایک قلعہ بہت اچھا یادگار قدیم کا باقی معلوم ہوتا ہے گبروں کی بارگاہ کہلاتا ہے۔

خاتمہ

آج ایران وطوران کا بوڑھا مسافر گھر آیا ہے۔ تھک چکا ہے۔ احباب سفر کی کیفیات پوچھنے آئے ہیں۔ مگر وعدوں پر ٹالا جاتا ہے۔ کہ صاحب گھبرائیے نہیں۔ ایک سفرنامہ تیار کروں گا۔ کہ کاغذ کے پردوں پر وہاں کی سین اور سینری آئینہ بن کر آپ کی آنکھوں کو ہمیشہ خیرہ کرتی رہیگی۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہوا۔ ہاں ہاں نہیں ہوا۔ جو ہوا۔ وہ سُن لیجئے۔

میں ہمیشہ ہمیشہ اس حرکت سے شرمندہ اور زندہ رہونگا کہ مجھ جیسا کج مج رقم حضرتِ آزاد کی ہر ایک تصنیف کیساتھ دیباچہ اور خاتمہ لگا کر شہیدوں کے دفتر میں نام لکھوائے مگر حیران ہوں کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ یہ ہندوستان ہے اگر کوئی اَور بامذاق ملک ہوتا۔ اور اس ملک کا تاجدارِ ادب اِس طرح نامکمل مسودات چھوڑ جاتا۔ تو ملک کے ہر کونے سے آوازیں بلند ہوتیں۔ یہاں تک کہ ہاتھوں ہاتھ ان سب کی تکمیل اس کی شان کے مطابق ہو جاتی۔ ہمارے ہاں یہ بات عنقا سے زیادہ کمیاب ہے۔

اصل واقعہ یوں ہے کہ مولانا نے اکثر جگہ سفر ایران کا ذکر کیا ہے اور سفرنامے کا وعدہ۔ جس کو پڑھ پڑھ کر میرا دل بہت کڑھا کرتا تھا کہ گذشتہ سال رفیق ہند اخبار کا ایک پرچہ ملا۔ جس میں مذکورہ بالا لیکچر چھپا ہوا تھا۔ اس کے پڑھنے

سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی سفرنامے کے لئے تمہید
لکھی ہے یا دیباچہ شروع کیا ہے کہ ہر ایک بیان کو مزے
لے لے کر شروع کرتے ہیں مگر آگے بڑھے چلے جاتے ہیں
کہ پھر بتائیں گے۔ اس کو دیکھ کر اور بھی زیادہ افسوس ہوا
غرض کہ اسی کو غنیمت جانا۔ دیباچہ لکھا اور کاتب کے
حوالے کیا۔ کاتب لکھ چکا۔ تو ایک دن ایک چھوٹی سی
تِلے دانی میں سے بہت سے چھوٹے رنگ برنگ کے
کاغذوں کا ایک گٹھا سا مِلا۔ کھولا۔ پڑھا۔ تو مولانا کے
ہاتھ کے لکھے ہوئے پرچے معلوم ہوئے۔ مگر خط اس قدر
شکستہ اور جلدی کا لکھا ہوا تھا کہ توبہ۔ اس پر طرح طرح
کے کاغذ قسم قسم کی سیاہی۔ کہیں پنسل ہی نے کارفرمائی
کی تھی۔ غرض کہ ہزاروں دِقتوں کے بعد بار بار پڑھنے سے
ان کو سمجھا۔ تو معلوم ہوا کہ سفر ایران کے شروع سے مولانا

نے نوٹ لکھنے شروع کیئے تھے۔ کہ اپنی یاد کے مطابق اشارے جگہ جگہ کے کتائے۔ کچھ ایسے ڈھب سے لکھے تھے کہ فرصت کے وقت جب بیٹھیں گے تو ان کو دیکھ دیکھ کر سفر کی یاد تازہ کریں گے۔ نقشے کھینچیں گے اور ایک ایک لفظ سے ہزار ہزار کر کے لکھیں گے۔ زبان کی بے تکلفی کا یہ عالم ہے کہ جو بات جس موقع پر مولانا نے دیکھی اور سُنی۔ اسی زبان میں فوراً قلمبند کر لی ہے۔ اختصار کی یہ کیفیت ہے کہ بعض جگہ کچھ اشارہ ہی لکھ کر بات ختم کر دی ہے۔ ان تمام کاغذوں نے آپس کے ربط ضبط سے ایسی علیحدگی اختیار کی ہے کہ سوائے تاریخوں کے اور چیز ان کے آگے پیچھے رکھنے میں مددگار نہ ہوسکی۔

اس کو پرائیویٹ ڈائری کہیئے یا روزنامچہ۔ جو کچھ بھی ہے مولانا کے لفظ لفظ کی نقل کر کے کاغذ کے سینے پر نکال کر

رکھ دیا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ بہت کچھ باقاعدگی کے ساتھ لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بوشہر پہنچنے کے بعد جہاں کہیں موقع ملتا ہے۔ مولانا نوٹ لکھ لیتے ہیں۔ بعض دفعہ کئی کئی دن کی کیفیت دو چار جملوں ہی میں لکھ کر ختم کر دی ہے۔ اکثر جگہ کئی کئی تاریخیں غائب ہیں۔ اور سفر کے آخیر حصے میں تو کچھ اندازہ ہی نہیں رہا۔ اِسی لئے میں نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے۔ کہ جن پرچوں کا آپس میں میل ملاپ نہیں اُن کو سب سے آخر میں ڈال دیا ہے۔ تاکہ قائم بھی رہیں اور ضائع بھی نہ ہو جائیں۔

زبان کے لحاظ سے بھی اس روزنامچے کی اُردو قابل دید ہے۔ اور اکثر جگہ جو فارسی لکھی ہے۔ اس کی تو شان ہی نرالی ہے۔ اور سب سے زیادہ خوبی کی یہ بات ہے کہ عموماً سفرنامے یا روزنامچے پبلک کے مذاق کا خیال کر کے مُصنّف لکھا کرتے ہیں مگر یہ روزنامچہ مُصنّف کے اصلی جذبات اور کیفیات کا

آئینہ ہے۔ یا یوں کہیئے کہ حضرتِ آزاد کی پرائیویٹ ڈائری ہے۔ جو وہ سفر ایران میں لکھتے رہے۔ یورپ میں اکثر دستور ہے کہ بڑے بڑے فلاسفروں کے مرنے کے بعد ان کی پرائیویٹ ڈائریاں چھپواتے ہیں۔ اس سے ان کی اندرونی اور بیرونی زندگی۔ ان کے دل اور دماغ کی کیفیات خوب نظر آسکتی ہیں۔ اس زمانے کے لوگ اور آئندہ نسلیں ان ڈائریوں سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اور یہ باتیں بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ مگر ہمارے مُلک میں یہ باتیں میسّر نہیں۔ شاید یہ روزنامچہ پہلی چیز ہے۔ جو اس شان سے نکلا ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے ملک کے اہلِ علم اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ ورنہ حضرتِ آزاد کے خیالات کا آئینہ تو یہ ضرور ہے۔ اس میں ان کے پرائیویٹ خیالات مذاق تجسس۔ ان کی بزرگانِ دین سے خوش اعتقادی اور

ہزاروں قسم کے نکتے ہیں جو جگہ جگہ پھول بن کر برستے نظر آئینگے اور بہت عرصے تک سفر کی یاد کو تازہ کرتے رہیں گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور بس۔

دُعا کا محتاج

طاہرہ نسیم آزاد

تبرکاتِ آزاد

یعنی

زبانِ اُردو کی مستند ٹکسال کے آخری سکے

دربارِ اکبری ایک نمونہ ہے قدرت کی قلمکاری کا جس میں جلال الدین محمد اکبر شہنشاہِ ہندوستان

اور اُس کے نورتن (امرائے جلیل القدر) کے دلچسپ حالات اس خوبی سے قلمبند کئے ہیں کہ مذاق سلیم عش عش کرجاتا ہے مؤرخانہ شان کے ساتھ اُردو علمِ ادب انشا پردازی کا ایسا عجائب خانہ دکھانے سے قاصر ہے۔

"ہزار میں سے ایک اور خرمن میں سے دانہ"

شہنشاہ اکبر کا خاص کیرکٹر۔ رنگارنگ شانیں۔ نورتن کے جلوس اور اُن کی گوناگوں جامہ زیبیاں۔ رزم بزم۔ شادی وغم۔ سیروشکار

خلوت و جلوت - دربارِ دربار - کوہ و بیاباں - دشت و دریا - صبح و شام غرض جہاں جس چیز کو دکھایا ہے لفظ نہیں جو اس کی حقیقی تعریف کرسکیں - زبان نہیں جو ان مورخانہ حقائق کا اعادہ کرسکے - ایں پیچ

۵۰۸ صفحہ ولائتی کاغذ ۲۹×۲۲ تقطیع - قیمت پانچ روپیہ (صہ) مع فوٹو مولٰینا آزاد

آبِ حیات یعنی مشاہیر شعرائے اُردو کی سوانح عمری

اردو زبان مذکور کی عہد بعہد کی ترقیوں اور اصلاحوں کے بیان کو مولٰینا کے جادو نگار قلم نے ایسی خوبی اور سلیقے سے ادا کیا ہے کہ اردو نظم کی دنیا کو پانچ دوروں میں دربار بنا کر آنے والی نسلوں کے سامنے دکھلایا ہے - حق یہ ہے کہ آبحیات کا ہر ایک دَور سرِستانِ ذوقِ سلیم کو ہر مطالعہ کے بعد جان تازہ بخشتا ہے - دل اس کی قادر الکلامی کے مزے لیتے ہیں - اور آنکھیں ان جواہر پاروں سے روشنی پاتی ہیں جنکو مصنف

نے عین نیک نیتی اور خلوص سے ہر قابلِ قدر ہستی کے تاجِ شہرت میں جڑ دیا ہے۔ عام شائقین کے علاوہ خصوصاً شعراء یا فنِ شعراء علم ادب کے مبتدیوں کے لئے تو "آبِ حیات" وہ معشوق باوفا ہے جو ہر وقت کلیجہ سے لگائے رکھنے کے قابل ہے۔ اس کی اردو سہل ممتنع اس کا بیان مہکتے ہوئے پھولوں کی لڑیاں اور اس کا دامن گلچیں ہے جو ہر وقت اور ہر موسم میں سدا بہار پھولوں سے مہکتا ہے۔ حجم ۵۵۲ صفحہ تقطیع ۲۰×۲۶۔ قیمت فقط (۳ روپے)

دیوانِ ذوق

یعنی مغل شہنشاہی کے آخری تاجدار سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ غازی کے استاد ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ کلام اور قصائد جس قدر بہم پہنچ سکا اور دیباچہ میں سوانح مؤلفہ شمس العلماء مولٰینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی۔ یہ انوکھی طرز اور شان کا دیوان ۳۵ سال بعد دوبارہ چھپا ہے۔ دیوان

کیا ہے۔ دِلّی کی آخری بہار کا افسانہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے زبان اردو کے آخری ادیبوں کی بزم آرائیاں۔ مشاعرے آپس کے توڑ جوڑ۔ آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں حضرت ذوقؔ کے اشعار کی شرح اور کلام کی شان نزول کو اس طرح ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو عالمِ محویت میں اُس زمانے کے شائقینوں میں دیکھنے لگتا ہے۔ اس قدر خوبیوں کے ساتھ نہائت عمدہ لکھائی چھپائی۔ تقطیع ۲۰×۲۶ -- ۳۶۰ صفحوں پر قیمت صرف دو روپیہ (عـہ)۔

سخندانِ فارس یعنی زبانِ فارسی کی جامع اور مکمل تاریخ

ژند۔ پہلوی۔ دری اور سنسکرت کے ہم معنی الفاظ کا تقابل پیدا کر کے نامور مصنف نے زبان فارسی کی ایک مکمل تاریخ بہم پہنچائی ہے جسکی ترتیب میں پندرہ سال کامل محنت شاقہ اٹھانی پڑی ہے۔ قوموں

کے باہمی تعلقات اور زبانوں کے میل جول سے مٹے ہوئے سراغوں کی تھاہ لگا کر اصل و فرع تغیر و تبدل کو صاف ظاہر کر دیا ہے۔ برِ اعظم ایشیا کے دو بڑے خطوں ایران اور ہندوستان کے رسم و رواج کا مقابلہ کرتے ہوئے مصنف ممدوح نے جگہ جگہ اپنی سیاحت ایران کے چشم دید حالات بھی موتی کی طرح ٹانک دیئے ہیں جن سے پہلی دنیا آجکل کی روشنی سے ٹکراتی ہے۔

زبان فارسی کی تاریخ اس سے بہتر دستیاب نہیں ہوسکتی۔ گویا علم کے دریا بہا دیئے ہیں۔ مشاہیر کے نظم و نثر کلام کا مابہ الامتیاز فرق دکھایا ہے سخندان فارس کا ایک مختصر سا رسالہ مطبع رفاہ عام میں چھپا تھا وہ اس کا ابتدائی حصہ تھا۔ اب کامل و مکمل ۱۳۱۷ صفحوں پر ۲۰×۲۶ تقطیع نہایت خوشخط سفید ولایتی کاغذ پر آزاد ٹائپ پر ڈپو نے چھپایا ہے۔ بایں ہمہ قیمت فقط دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ۲) ❊

نگارستانِ فارس سخندانِ فارس کے بعد مولینا نے

ادبِ فارس کو اس آویزہ جواہر سے سجانا چاہا تھا مگر افسوس! عالمِ بیخودی نے یارانہ دیا اور مکمّل مسودے کو بیگانگی کے ہاتھوں سے تھپک کر سُلا دیا۔ اب خوش قسمتی نے بارہ اور بارہ چوبیس برس کے بعد آنکھیں کھولیں اور ایک پُرانے دقیانوسی بستے میں سے یہ لعلِ بے بہا جُوں کا تُوں نکل آیا۔ نگارستانِ فارس کیا؟ بس یوں کہئے کہ فارسی شعرا کو آبحیات پلایا ہے "اور نگارستانِ فارس" یعنی مشاہیر شعرائے فارس کا تذکرہ اور زبان مذکور کی عہد بعہد کی ترقیوں کو اُن کے کلام کے ساتھ مؤرخانہ شان لئے ہوئے آبحیات کے لفظوں میں ادا کیا ہے۔ خدائے سخن اُستاد رودکی سے لیکر واقف لاہوری تک کے حالات سے نگارستان کو آراستہ کیا ہے۔ اتنی خوبیوں کے باوجود قیمت فقط تین روپیہ حجم ۴۲۰ صفحہ تقطیع ۲۰×۲۶۔

المشتہر

آغا محمد طاہر منیجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور